جلد 7 شمارہ 4 جون 2005ء ربیع الثانی 1426ھ

قد افلح من تزکّٰی ○ وذکر اسم ربّہٖ فصلّٰی ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔
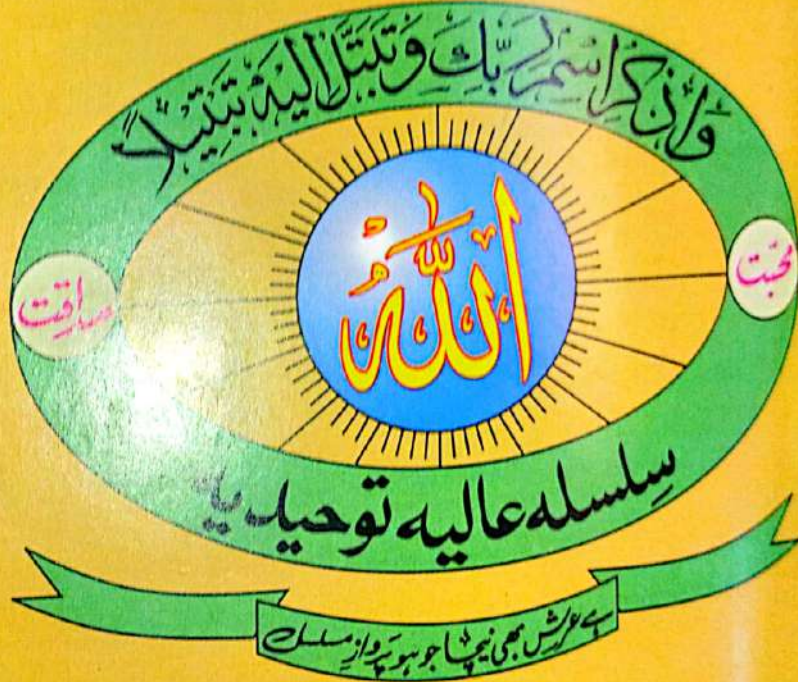
واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا

اللہ

محبت

صداقت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاح آدمیت

گوجرانوالہ

CPL No.

Registerd

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت ...

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

بانی سلسلہ

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

نگران و سرپرست

محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 7 شمارہ 4 جون 2005ء ربیع الثانی 1426ھ

ایڈیٹر **وحید احمد**

قیمت ——— 20/- روپے
سالانہ فنڈ ——— 200/- روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:0431-862835
Mob: 0320-5793520

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:0431-881379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

مضمون	مصنف	صفحہ نمبر
اداریہ	وحید احمد	1
حسن مومن	قبلہ محمد صدیق ڈار توحیدی	4
نئے سلسلے کی ضرورت	قبلہ محمد صدیق ڈار توحیدی	8
ابتدائی ملاقاتیں اور بیعت	آفتاب احمد خانؒ	16
رسول اکرمؐ کی سیرت کا مطالعہ کس لئے کیا جائے	ڈاکٹر حمید اللہ	20
وحی اور اُس کی حقیقت	مولانا محمد تقی عثمانی	25
اطاعت رسول کی حدود	مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری	31
حقیقت انسان	مرسلہ حافظ محمد یاسین توحیدی	42
جہاں حضورؐ آرام فرما رہے ہیں	فیروز الدین احمد فریدی	45
اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	53

اداریہ

ولاتکونوا کالذین نسواللہ فانساھم انفسھم o

خدافراموشی کا نتیجہ خودفراموشی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔علم وعقل،دولت واقتدار،روشن دماغی ودل کا احساس،دانش کدے وکتب خانے اور شعراء کی محفلیں وعلماء کی مجلسیں سب کچھ موجود ہونے کے باوجود جب خدافراموشی آتی ہے تو خودفراموشی کی نحوست سے محفوظ رہنا ممکن نہیں۔ خودفراموشی انفرادی نوعیت کی ہوتو اِس کے مضر اثرات محدود ہوتے ہیں اور اگر وہ اجتماعیت کی صورت اختیار کرے تو پھر پورا معاشرہ بگاڑ اور فساد کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔زندگی کا پورا نظام تباہ وبرباد ہوجاتا ہے۔ساری سوسائٹی تہہ وبالا ہوکر رہ جاتی ہے اور **ظهر الفساد فی البر و البحر** کا نقشہ سامنے ہوتا ہے۔

سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل یہی حالت تھی۔انسانیت تباہ وبرباد تھی۔ اس کی کوئی شکل نہ تھی۔پورا معاشرہ فساد کی لپیٹ میں تھا کوئی اس کو ذرا سہارا دینے کیلئے تیار نہ تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ کو واضح اور مکمل دین عطا فرمایا گیا۔آپ نے پوری دنیا کو چیلنج کیا! اے دنیا والو تمہاری زندگی کا پورا نظام غلط ہے۔تمہاری عادتیں،اخلاق،تمہارے رسوم،مسلمات سب غلط ہیں۔آپ نے تن تنہا اِس دعوت کا آغاز کیا اور جان کی بازی لگادی۔خطرات میں اپنے آپ کو ڈال دیا اور باطل سے ٹکرا گئے۔ایک موقع پر جب چچا نے شکوہ کیا اور کام کو موقوف کرنے کی بات کی تو فرمایا۔چچا اگر وہ میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے ہاتھ میں سورج کو دیں تب بھی میں اپنے مشن سے باز نہ آؤں گا۔

۲۳ سال میں آپ نے وہ انقلاب برپا کیا کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی،اختلاف استعداد کے باوجود ایک چیز ہزاروں لاکھوں افراد میں نمایاں ہوکر سامنے آئی۔وہ ایک بجلی تھی جو سب میں کوندرہی تھی۔ایک روح تھی جو سب میں تڑپ رہی تھی۔وہ بادشاہ ہوں یا گدا،امیر ہوں یا غریب،حاکم ہوں یا محکوم،قاضی ہوں یا گواہ،افسر ہوں یا سپاہی،استاد ہوں یا شاگرد،عابد وزاہد ہوں یا کاروباری،غازی ہوں یا شہید توحید کا نور،اخلاص کی روح،قربانی کا ولولہ خلق کی ہدایت د

راہنمائی کا جذبہ اور بالآخر ہر کام میں خدا کی رضا جوئی کا جوش ہر ایک کے اندر کام کر رہا تھا وہ جو کچھ بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں اور جو کچھ بھی کر رہے ہوں یہ فیضان حق سب میں یکساں اور برابر تھا۔

صحابہ کرامؓ کی یہ مقدس جماعت ہی محمد رسول اللہ ﷺ کے مشن کو لے کر آگے بڑھی اور رہتی دنیا تک کیلئے اِس نے آپ کی دعوت کو بقاء دوام کی دولت سے ہمکنار کر دیا۔ اِس پاکباز گروہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم مٹ سکتے ہیں ختم ہو سکتے ہیں لیکن ہم دنیا سے اپنے لئے کچھ نہ لیں گے ہم اللہ تعالیٰ کی امانت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کو جہاں تک ممکن ہو گا پہنچا کر دم لیں گے۔

آپ کی لگاتار و مسلسل تعلیم و تربیت اور سعی و کاوش کے نتیجہ میں پورے معاشرے کے رسم و رواج بدل گئے۔ عادتیں اور خصلتیں تبدیل ہو گئیں۔ ایک آدمی کی عادت کو بدلنا مشکل ہوتا ہے۔ بڑے بڑے دانشمند اور حکیم عاجز نظر آتے ہیں۔ لیکن رسول اکرم ﷺ کے طفیل ہزاروں ولاکھوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔

اِس وقت ہدایت ربانی اور دعوت آسمانی موجود نہ تھی۔ تب انسانیت درد و کرب سے کراہ رہی تھی۔ آپ تشریف لائے۔ تو دنیا کے دن رات تبدیل ہو گئے۔ شقاوت کی جگہ سعادت، ظلم کی جگہ انصاف، جہالت کی جگہ علم اور بداخلاقی و انارکی کی جگہ اخلاق اور شرافت کا دور دورہ ہوا۔

آج وہ ہدایت ربانی اور دعوت آسمانی موجود ہے لیکن پھر بھی ایک بھائی دوسرے بھائی کا گلہ کاٹ رہا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا گھر اور دوکان جلا رہا ہے۔ ایک دوسرے کی آبرو پائمال کر رہا ہے۔ ہر طرف ظلم و ستم خود غرضی اور نفس پرستی کا بازار گرم ہے۔

کیونکہ ہم نے خدا فراموشی اور خود فراموشی کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے۔ سیرت کے جلسے بہت ہو رہے ہیں۔ عید میلاد کے بڑے جلوس نکل رہے ہیں۔ بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی جا رہی ہے۔ پھر بھی ہسپتالوں میں ڈاکٹر اور نرس مریض پر رحم و ہمدردی کے جذبے سے خالی ہیں۔ عدالتوں میں جج کرسی عدالت پر بیٹھ کر مشق ستم میں مشغول ہیں انتظامیہ کے ہر شعبے میں جدھر دیکھئے اِنتظامی مشنری ہر چیز سے آراستہ ہونے کے باوجود

صرف نظم و نسق میں قائم کرنے سے محروم ہے۔ احکامِ اسلام سے روگردانی عام ہے۔ فرائض و واجبات کا احترام باقی نہیں رہا۔

اس لئے ہم خوش حالی اور ترقی کیلئے جو بھی پلاننگ کرتے ہیں یا منصوبے بناتے ہیں۔ تو نتیجۃً بدحالی اور اخلاقی گراوٹ میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ دل ٹھیک نہیں اس میں ناسور ہو گیا ہے۔

ہمارے لئے سرور کائنات ﷺ کی تعلیمات کی طرف رجوع ضروری ہے۔ اسی میں ہمارا علاج بھی ہے اور وہی ہماری صلاح و فلاح اور استحکام کے لئے ناگزیر بھی۔

والسلام

وحید احمد

حسن مومن

(قبلہ محمد صدیق ڈار توحیدی)

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور یومِ آخرت پر ایمان انسان کے خیالات اور کردار میں ایک حسی
انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ مومن اِس حقیقت کو دل سے تسلیم کر لیتا ہے کہ اللہ ساری کائنات
خالق، مالک اور حکمران ہے۔ ہر جاندار اور ہر کام کے انجام کی ڈوری اسی کے ہاتھ میں ہے۔
واقعہ اور ہر حادثہ اس کے اذن سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کر
چاہے تو اس بھلائی کو کوئی روک نہیں سکتا اور اگر وہ کسی کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کی اپنی ذات
کے سوا کوئی دوسرا اسے ہٹا نہیں سکتا۔ وہ جس کا رزق چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے
چاہے روزی تنگ کر دیتا ہے۔ سورج، چاند، ستارے اور کہکشائیں سب اسی کے زیرِ فرمان گردش
کر رہے ہیں۔ وہ چیونٹی کے چلنے کی آواز بھی سن لیتا ہے اور ہمارے سینوں میں پیدا ہونے وال
وسوسوں کو بھی جانتا ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں وہ ہر وقت ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ زندگی
صحت، قوت، دولت، منصب اور عزت سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ اپنی مخلوق پر ہر طرح کی
قدرت رکھتا ہے۔ جس کو چاہے پیدا کرے، جس کو چاہے مارے، جس کو چاہے بنائے، جس
چاہے بگاڑے، جس کو چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔ یہ قدرت مخلوق میں سے کسی
بھی حاصل نہیں ہے۔ اِن عقائد کی وجہ سے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرنے کی برکت سے مومن
اطمینانِ قلب کی دولت نصیب ہو جاتی ہے اور وہ خوف وحزن کی کیفیات سے نجات حاصل کر
ہے کیونکہ اِسے یقین کامل ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں اور محنت کے مطلوبہ نتائج اِس وقت تک
حاصل نہیں ہو سکتے جب تک خالق کائنات کی منظوری شامل حال نہ ہو۔ جس طرح بس یا ہو
جہاز کے مسافر اپنے جیسے ایک انسان ڈرائیور اور پائلٹ کی عقل اور مہارت پر بھروسہ کر کے را
کی ٹریفک اور دشواریوں سے بے نیاز ہو جاتے اور بے فکری سے سفر کرتے ہیں اِسی طرح
مومن پوری کائنات کے نظام کو چلانے والے علیم وحکیم حکمران پر توکل کر کے تسلیم ورضا کا

اختیار کر لیتا اور زندگی کے معاملات اور رزق کی کمی بیشی کے تفکرات سے آزاد ہو جاتا ہے۔
علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔ ؎

گر خدا داری زغم آزاد شو
از خیال بیش و کم آزاد شو

چھوٹے بچے اپنے باپ کے بھروسے پر ہر غم سے آزاد بے فکری کی زندگی گزارتے ہیں حالانکہ وہ محدود ذرائع کا مالک اور تھوڑا سا پیار کرنے والا ایک فانی انسان ہوتا ہے۔ تو ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرنے والے، ہر چیز کے مالک، حی و قیوم اور رحمٰن و رحیم اللہ پر ایمان رکھنے والا مومن کس طرح غم روزگار میں مبتلا رہ سکتا ہے۔ مومن دنیا و آخرت کی ہر بہتری کے حصول کیلئے حتی المقدور سعی اور جدو جہد کرتا ہے لیکن اپنی کوشش اور ذرائع پر بھروسہ ہرگز نہیں کرتا اور حسب دلخواہ نتائج کیلئے اللہ سے مدد طلب کرتا ہے۔ وہ دنیوی ترقی، کاروبار کی وسعت، فراخی رزق، نعمتوں کی فراوانی اور اپنی اولاد کی کامرانی کو اپنی ذہانت، محنت یا اسباب کی موافقت سے ہرگز منسوب نہیں کرتا بلکہ اللہ کے فضل اور اِس کی رحمت کا نتیجہ گردانتا ہے اور اِن پر فخر و تکبر ہرگز نہیں کرتا۔ اگر اِس پر کوئی مصیبت آن پڑے یا رزق میں تنگی آ جائے تو اِسے بھی اپنے اللہ کی طرف سے سمجھتے ہوئے خوشی سے قبول کر لیتا ہے۔ وہ امیری غریبی اور دُکھ سکھ دونوں کو اللہ کی طرف سے آزمائش جانتے ہوئے، نعمتوں پر اللہ کا شکر بجا لانے والا اور مصائب کو خوشی سے برداشت کرنے والا بن جاتا ہے۔ وہ ہر آن اللہ کے فضل اور اِس کی رضا کا متلاشی رہتا ہے اور خود بھی ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہتا ہے۔ وہ دنیا میں بڑا بن کر نہیں بلکہ اللہ کا عاجز بندہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اِس لئے نہ تو وہ کسی کا حق غصب کرتا ہے نہ ہی زور و ظلم یا مکر و جبر سے دوسرے انسانوں پر فوقیت اور حکمرانی کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ توحیدِ الوہیت کے ساتھ ساتھ وحدتِ آدمیت کا بھی علمبردار ہوتا ہے۔ وہ اپنی فکری صلاحیتوں، روحانی اہلیتوں اور مادی وسائل کو اللہ کی مخلوق کی بھلائی کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اللہ رب العالمین پر ایمان کی بدولت مومن کو پوری کائنات میں کوئی بھی چیز بیگانی اور اجنبی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وہ سب کو اپنے حقیقی مالک اور محبوب آقا کی پیاری رعیت سمجھتا ہے اور اِس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ کی مخلوق کو نفع پہنچانے ہی سے اِس کی رضا حاصل کی جا سکتی

ہے۔ اِس طرح اس کی محبت، ہمدردی اور خدمت مخصوص دائروں کی پابند نہیں رہتی اور وہ عالمگیر محبت کا علمبردار بن کر اللہ کی ساری مخلوق کا خیر خواہ بن جاتا ہے۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے ڈرتا ہے نہ ہی کسی سے مدد کی توقع رکھتا ہے۔ اِس لئے اِس کی ذہنیت کبھی غلامانہ نہیں ہوتی اور وہ تلواروں کی چھاؤں میں بھی کلمہ حق بلند کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ وہ متواضع اور منکسر المزاج ہونے کے ساتھ ساتھ خوددار، بلند حوصلہ اور جرات و بہادری کا پیکر بھی ہوتا ہے۔ وہ اِس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے، وہ اسباب کا محتاج نہیں بلکہ خود مسبب الاسباب ہے۔ اللہ کی رحمت اِس کے غضب پر ہمیشہ غالب رہتی ہے اور ہماری بڑی سے بڑی مشکل کو حل کرنا اللہ کے لئے بہت ہی آسان ہے۔ اِس لئے مومن بدترین حالات میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ رجائی ہوتا ہے اور مایوسی کو کبھی نزدیک نہیں آنے دیتا۔ مومن کے دل میں اللہ کی محبت اور کثرت ذکر کی برکت سے ایک ایسی حرارت اور برقی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی لذت میں وہ بڑی سے بڑی مصیبت کو ہنستے مسکراتے برداشت کر لیتا ہے۔ مومن کا مرنا اور جینا اللہ کے لئے ہو جاتا ہے وہ اللہ کی راہ میں مال و دولت خرچ کرتے وقت یہ نہیں سوچتا کہ کل کھانے کو کہاں سے آئے گا۔ اللہ کی راہ میں اگر اِسے اپنی جان بھی دینی پڑے تو اِس طرح خوشی سے دے ڈالتا ہے گویا پردیس سے اپنے وطن جا رہا ہو کیونکہ اِسے یقین کامل ہوتا ہے کہ حقیقی اور دائمی زندگی آخرت کی ہے اور دنیا کی زندگی اِس کے مقابلے میں عارضی اور گھٹیا ہے اِس لئے وہ اپنی خواہشات کو اللہ کے احکام کے تابع کر دیتا ہے اور دنیا اور اِس کی کسی چیز کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا۔ وہ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت میں وہ لذت اور کشش ہے کہ مومن کی نگاہوں میں اِس کے حسن کے سوا اور کچھ جچتا ہی نہیں۔ مومن کی زندگی کا مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی محبت کو کمال تک پہنچائے، ایمان کی ابتدا اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود، محبوب اور مقصود تسلیم کرنے سے ہوتی ہے۔ اللہ والے فقیروں کی صحبت کے اثر سے جب مومن کے دل میں محبت کا بیج پھوٹتا ہے تو دل ایسی انوکھی لذت سے آشنا ہوتا ہے کہ اِس کی نگاہوں میں دوسری ہر لذت ہیچ ہو جاتی ہے۔ اِس کی بے نیازی کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے قرب و دیدار کی خواہش کے سوا اور کوئی خواہش اِس کے دل میں باقی نہیں رہتی وہ اللہ کی محبت میں اِس

قدر رنگین ہو جاتا ہے کہ فرشتوں کے تقدس اور حور و قصور کے حسن پر نگاہ التفات ڈالنا بھی اسے گوارہ نہیں ہوتا۔ علامہ اقبالؒ نے اِس کی کیفیات کے اظہار کیلئے "ضربِ کلیم" میں مومن کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اسے یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مومن دنیا میں

ہو حلقہ، یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اِس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اِس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

جنت میں

کہتے ہیں فرشتے دل آویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

نئے سلسلہ کی ضرورت

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

برادرانِ کرام! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انقلابِ زمانہ سے بہت سے پرانے علوم بے قدر و قیمت ہو جاتے ہیں اور کئی نئے علوم پیدا ہو کر انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ انسانی نظریات میں تغیر آ جاتا ہے اور لوگوں کی سوچ اور فکر کے انداز بھی بدل جاتے ہیں، حتیٰ کہ مذہبی عقائد اور تصوف بھی محفوظ نہیں رہتے۔ موجودہ زمانے میں تو یہ تبدیلیاں اِس قدر شدت اور عجلت سے ہو رہی ہیں کہ علماء اور صوفیاء کی اکثریت مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سوچ اور اندازِ فکر کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ مغربی تعلیم اور طرزِ حیات سے متاثر نوجوان ہر بات پر کیوں اور کیا کا جواب چاہتے ہیں۔ اندھی تقلید اُن کے لئے بے معنی سی بات بن گئی ہے۔ وہ قرآن اور احادیث کو نئے علوم کی روشنی میں پرکھنا اور جانچنا چاہتے ہیں۔ اُنہی لوگوں میں سے جو اپنے طبعی رجحان کی وجہ سے رُوحانیت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ وہ ترکِ دنیا اور رُہبانیت کی تبلیغ کرنے والے فرسودہ خانقاہی نظام کو کسی صورت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ موجودہ زمانے کے اکثر و بیشتر صوفی اور پیر علومِ حاضرہ سے ناواقفیت کی وجہ سے ان لوگوں کی ذہنیّت، نظریات، اندازِ فکر اور طرزِ استدلال کو نہ تو سمجھ سکتے ہیں نہ ہی اُن کی تسلی کر سکتے ہیں۔ جدید علوم سے آراستہ طبقہ کے لوگ اُمتِ مسلمہ کو دوسری اقوام پر غالب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کیلئے وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان عبادات اور اخلاق و کردار کے ساتھ ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی، تسخیرِ کائنات اور جنگی قوت میں بھی سب سے آگے رہیں تاکہ دنیا میں اللہ کی مشیّت اس انداز سے نافذ کرنے کے اہل ہو سکیں کہ انسانیت معاشی، معاشرتی اور سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کرے۔ ہر انسان کے لیے بلالحاظِ مذہب، قومیت اور رنگ و نسل بنیادی حقوق کی ضمانت ہو۔ تمام علوم، ایجادات اور انکشافات ساری انسانیت کا مشترکہ ورثہ قرار پائیں اور ان کی برکتوں سے ہر انسان مستفید ہو سکے۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے ارشاد فرمایا۔

نکتہ شرع مبیں ایں است و بس
کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس

یعنی شریعت حقہ کا مقصود و مطلوب ہی ایسا نظام عدل وجود میں لانا ہے کہ انسان کسی بھی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے انسانوں پر صرف اللہ کی حاکمیت قائم ہو جائے اور تمام استحصالی نظام جن کی وجہ سے مختلف انسانی گروہ نسل، وطن اور مذہب کی بنیاد پر دوسرے انسانوں کا شکار کھیلتے ہیں نیست و نابود ہو جائیں۔

ابھی تک آدمی صیدِ زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے

یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ سائنس پڑھنے والوں کو کافر قرار دینے اور علم کو صرف قرآن اور حدیث پڑھنے تک محدود رکھنے والے عالموں اور صوفیوں کے معتقد نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ زندگی کی جدوجہد سے کنارہ کش ہونے کی بجائے بھرپور زندگی گذارنے کا عزم رکھتے ہیں اور اللہ کریم کی پیدا کردہ نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ اللہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ اُن کو کسی ایسے سلسلے کی ضرورت تھی جس کی تعلیم انتہائی آسان اور مختصر ہو۔ جس میں رُوحانی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیوی ترقی اور خوشحالی کے حصول کی ہدایات بھی شامل ہوں۔ جس میں اُخروی فلاح کے پیغام کے علاوہ مخلوق خدا کی خدمت اور اُنکی دنیوی زندگی کو بہتر اور پر آسائش بنانے کا درس بھی موجود ہو۔ جو ایسا لائحہ عمل پیش کر سکے۔ جس پر عمل کر کے ملت اسلامیہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکے۔ جس کا ساقی صرف شرابِ طہوری پلا کر مدہوش کرنے والا ہی نہ ہو بلکہ اِس گری ہوئی قوم کو پستی سے اُٹھا کر سوئے منزل گامزن کر دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ جس کی تعلیم ایک طرف قرآن و سنت کے عین مطابق ہو اور دوسری طرف اِس طرح پیش کی جائے کہ ماڈرن تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنیت کی تشفی کر سکے۔ اُنہیں ایسی روحانی تعلیم کی طلب تھی جو وحدت الوجود کی بھول بھلیوں میں ڈالنے کی بجائے شرک سے یکسر پاک قرآنی توحید کی راہ پر چلائے۔ جو اُن میں اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کے حصول کا ذوق و شوق بیدار کر سکے اور کرامات کے افسانوں میں گم

کرنے کی بجائے، ''یزداں بکمند آور ائے ہمت مردانہ'' کے مصداق اللہ کے قرب اور دیدار کو اِن کی منزلِ مقصود ٹھہرائے۔

اِس اہم ترین ملی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے اللہ رحیم و کریم کی تائید و نصرت سے حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری نقشبندی، مجددی توحیدیؒ نے تصوف کے پرانے اشغال و اعمال اور مجاہدے کے طریقوں میں مناسب تبدیلیاں کر کے اُن کو نئے زمانے کی ذہنیت اور مقتضیات کے عین مطابق ڈھال کر ''سلسلہ عالیہ توحیدیہ'' کی بنیاد رکھی تا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نوجوان اور دوسرے راہ گم کردہ طالبانِ حق دنیا کے سارے کام سرانجام دیتے ہوئے اِس آسان ترین تعلیم پر عمل کرتے ہوئے گوہر مُراد حاصل کر سکیں۔ اِس طرح وہ سب کچھ جو پہلے ناممکن خیال کیا جاتا تھا اِس نئے سلسلے کی برکت سے ممکن اور سہل الحصول بن گیا۔ وَبِاللہ التوفیق

مختصر سوانح بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ:۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے بانی حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو جوارِ دہلی کے شہر فرید آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ پانی پت کے معروف انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب صحابی رسولؐ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے جن کو مدینہ منورہ میں حضور نبی کریم حبیب خدا ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حضرت حافظ عبدالرحیمؒ تھا۔ آپ کے دادا مولانا عبدالعزیزؒ جو ججی کے منصبِ عُلیا سے ریٹائر ہوئے نہ صرف ایک جید عالم دین تھے بلکہ ایک کامل ولی اللہ اور مردِ حق آگاہ تھے۔

اُنہی کی تربیت کے فیض سے آپ کو تصوف کا جذب و شوق اور فقراء سے محبت و موانست کا ذوق ارزانی ہوا۔ آپ پیدائشی ولی اللہ تھے چنانچہ بچپن ہی میں آپ سے کرامات کا ظہور ہونے لگا لیکن آپ ہمیشہ کرامات سے زیادہ تعلیم کو اہمیت دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے ''اِن کرامات میں میرا تو کوئی کمال نہ تھا۔ نہ اُس وقت میں بیعت ہوا تھا نہ ہی اللہ اللہ کرتا تھا۔ یہ تو محض اللہ کا کمال ہے کہ اُس نے جس نہج پر چاہا مجھے پیدا فرما دیا''۔

ابھی آپ نے زندگی کی دس بہاریں دیکھی تھیں کہ دادا جان کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مگر اُن کی

تعلیم و تربیت نے ذہن پر توحید کا بڑا گہرا اثر چھوڑا۔ آپ لڑکپن ہی سے تلاش حقیقت میں سرگرداں رہنے لگے۔ بیسیوں بزرگوں اور فقیروں کی خدمت میں حاضری دی۔ عجیب و غریب رنگ کے درویشوں سے ملنا ہوا۔ بڑی بڑی درگاہوں اور آستانوں کے سجادہ نشینوں کے پاس بھی گئے لیکن کہیں بھی طبیعت نہ جمی۔ آپ اپنے پہلے خطبہ میں تحریر فرماتے ہیں۔" مجھے ایک ایسے بزرگ کی جستجو تھی جو شریعت کا پابند ہونے کے ساتھ ساتھ روشن خیال بھی ہو۔ تنگ خیالی سے مجھے بچپن ہی سے کوفت ہوتی تھی۔ میں صرف کشف و کرامات کو بزرگی کا ثبوت نہ جانتا تھا۔ مجھے تو ایسے بزرگ کی تلاش تھی جو صاحب علم، صاحب عرفان اور صاحب تحقیق ہو۔ کشف و کرامات دکھانے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن عارف اور محقق کہاں نظر آتے ہیں"۔ آخر کار اِس تلاش و طلب کا نتیجہ نکلا اور بہت اچھا نکلا اور آپ کی ملاقات اچانک اور اتفاقاً حضرت مولانا کریم الدینؒ سے ہوگئی۔ آپ پہلے ہی دن حضرت مولانا کی خدمت میں چھ گھنٹے حاضر رہے اور بیعت ہو کر ہی اُٹھے۔ یہ سعادت آپ کو ۱۹۱۱ء میں جبکہ آپ کی عمر ۱۸ برس کی تھی اور نویں کلاس میں پڑھتے تھے حاصل ہوئی۔

حضرت مولانا کریم الدین احمدؒ "دھوج" کے رہنے والے تھے جو دہلی سے کوئی پچیس تیس میل جنوب میں واقع ہے۔ مولانا کسی گدّی یا خانقاہ کے سجّادہ نشین نہ تھے بلکہ ایک گمنام بزرگ اور ہر لحاظ سے ایک کامل فقیر تھے۔ بیعت ہونے کے بعد آپ نے بڑی جانفشانی اور جوش و خروش سے مُرشد کے بتائے ہوئے اشغال و اوراد جاری رکھے اور ۲۳ برس کی عمر میں آپ کو سندِ خلافت عطا ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی مُرشد نے یہ ہدایت کی کہ اب تم نوافل تہجد پر بہت زور دو اور جس قدر زیادہ ممکن ہو تلاوت اور تفکّر یعنی مراقبے میں وقت گزارا کرو۔ مولاناؒ آپ کو یہ بشارت دے گئے تھے کہ تمہارے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک ایسی چیز پیدا کی ہے کہ جب تک تم زندگی میں خدا کو نہ دیکھ لو گے مرو گے نہیں اور یہ بات بھی کہ میرے مرنے کے کافی عرصہ بعد تمہیں ایک دوست ملے گا۔ جس کی صحبت سے تمہارے اندر وہ صلاحیتیں پیدا ہو جائیں گی جو جیتے جی اللہ کا دیدار حاصل کرنے کے لیے لازمی ہیں اس کے پاس تمہارا حصہ ہے وہ ملے گا تو تمہارا کام بن

جائے گا۔ چنانچہ آپؒ نے اپنے رُوحانی سفر کے بارے میں اپنی تصنیفِ لطیف ''حقیقتِ وحدت الوجود'' میں تحریر فرمایا۔

میں ۱۹۱۱ء میں جبکہ میری عمر ۱۸ سال تھی خاندانِ نقشبندیہ مجدّدیہ میں بیعت ہوا اور سات آٹھ سال کی سخت اور متواتر جدوجہد کے بعد نقشبندیہ سلوک پورا کرلیا۔ اس سلوک سے طبیعت میں انکسار، توّرع اور کشف و کرامات تو حاصل ہو گئیں لیکن جس مقصد کے لیے بیعت ہوا تھا وہ حاصل نہ ہوا یعنی رویتِ باری تعالیٰ حاصل نہ ہوئی۔ اس کے بعد خاندانِ چشتیہ میں بیعت کی اور پانچ چھ سال میں یہ سلوک بھی طے کرلیا۔ اس سلوک سے طبیعت میں لطافت، اخلاق میں شیرینی، حُسن اور جمالیات کا ادراک اور عشق و محبت کا سوز و گداز تو میّسر آ گیا لیکن رویتِ باری تعالیٰ یہاں بھی عنقا ہی رہی۔ اس کے بعد اور کسی سلسلہ میں بیعت تو نہ ہوا مگر قادریہ اور دوسرے کئی سلسلوں کے سلوک کا مطالعہ بالاستیعاب کیا لیکن رویت کے حصول کا وہاں بھی کوئی ذکر نہ تھا۔ اب میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور کسی لطیفہءغیبی کا منتظر رہا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور ایک بزرگ (حضرت رسالدار محمد حنیف خاںؒ) سے ملاقات کرادی۔ یہ حضرت اویسی تھے۔ نہ خود کسی سے بیعت تھے نہ بیعت فرماتے تھے اس لیے بیعت تو نہ ہو سکا لیکن بیس پچیس سال ان سے فیضِ کثیر ملتا رہا۔ اب میں فیض تو ان سے لیتا تھا لیکن ذکروفکر اپنے اُسی پرانے سلسلے نقشبندیہ کا کرتا تھا۔ اس مرتبہ سلوک عجیب طرح سے طے ہوا یعنی ناسوت سے ذاتِ بحت تک سارے راستے گردوپیش کے ماحول کو دیکھتا اور سمجھتا ہوا گزرا۔ یعنی پہلے دوزخ کے طبقات دیکھے پھر علی الترتیب اعراف، ملکوت، جبروت، لاہوت، ہاہوت، کی جنتوں کی سیر کرتا ہوا ہو کے نچلے طبقے میں داخل ہوا۔ یہاں مجھ پر وحدتُ الوجود کی کیفیت طاری ہوئی۔ یہ وہی کیفیت ہے جسے جناب ابنِ عربیؒ نے حقیقت فرمایا ہے۔ الحمدللہ کہ میں نے یہاں زیادہ قیام نہیں کیا ورنہ میں بھی وجودی ہو کر رہ جاتا۔ جب میں ہُو کی اوپر والی سطح پر پہنچا تو وہاں وہ کیفیت نظر آئی جس کو مجدّد صاحبؒ نے ظلیت کہا ہے۔ یہاں سے بھی جلدی ہی نجات مل گئی۔ اِس کے بعد میں کچھ عرصہ عدم میں رہا لیکن برابر آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ عدم کو پار کر کے عالمِ امر میں داخل ہو گیا۔ اور آخر کار ۲۶، ۲۷ برس کی

متواتر کوشش کے بعد ۱۹۵۳ء میں اپنے مقصد حیات سے ہمکنار ہوا۔ الحمد للہ! جو چاہتا تھا مل گیا"

آپ ظاہر پرستی، شخصیت پرستی اور رُہبانیت کے سخت مخالف تھے اس لئے نہ تو ساری عمر کبھی فقیرانہ وضع قطع کا لباس پہنا اور نہ ہی گوشہ نشینی اختیار کی۔ آپ نے متاہل اور بھرپور زندگی بسر کی۔ آپ کاروبار بھی کرتے رہے اور ملازمت بھی کی۔ کچھ عرصہ دہلی میں انڈین آرمی کے جی۔ ایچ۔ کیو میں مترجم کے فرائض بھی ادا کرتے رہے آپ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی سے ہجرت کر کے بذریعہ ریل لاہور پہنچے اور پھر کراچی چلے گئے کچھ عرصہ آپ پاکستان ائیرفورس کے سٹیشن ڈرگ روڈ اور ملیر کینٹ میں لائبریرین کے طور پر کام کرتے رہے۔ اِسی دوران میں آپ کی صحبت کیمیا اثر نے کئی احباب کو متاثر کیا اور ان کے من کی دُنیا بدل ڈالی۔ ۱۹۵۱ء میں پاک فضائیہ کے ملازم چند طالبانِ حق کو اپنے دست حق پرست پر بیعت فرما کر رشد و ہدایت کے سلسلے کی ابتدا فرمائی جو اللہ کی تائید و نصرت سے پھیلتا چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں پاک فضائیہ کی چھاؤنیوں میں حلقہ ہائے ذکر قائم ہو گئے۔ پھر ائیرفورس کے بھائیوں کے توسط سے یہ روشنی اُن کے آبائی شہروں، قصبوں اور دیہات تک پہنچ گئی۔ ۱۹۵۵ء میں ملازمت ترک کر کے آپ مستقل طور پر بنوں چلے گئے جہاں متروکہ جائیداد کے عوض آپ کو محلّہ قصاباں میں مکان نمبر 746/c الاٹ ہو گیا۔ وہاں آپ نے حلقہ کی باقاعدہ تنظیم کی اور اِس کا نام سلسلہ عالیہ توحیدیہ رکھا اور اِسکی تعلیم کی اساس و بنیاد خالص توحید پر رکھی۔ اِسی دوران میں آپ نے مشہور کتاب ''تعمیر ملت'' تصنیف فرمائی۔ جس سے ہزاروں طالبانِ راہِ خدا نے فائدہ اُٹھایا اور اب بھی مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ آپ نے سلسلہ کے اذکار و اشغال اور آداب و قواعد کو "طریقت توحیدیہ" کے نام سے قلمبند فرمایا۔ یہ کتاب سلسلے میں شامل مریدین کے نجی اِستعمال کیلئے ہے اور یہ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے آئین کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۹۶۲ء میں آپ بنوں سے ترکِ سکونت کر کے لاہور تشریف لے آئے اور بنوں والا مکان وقف کر دیا۔ قیامِ لاہور کے دوران ''حقیقتِ وحدت الوجود'' تحریر فرمائی۔ جو اس موضوع پر مختصر اور فیصلہ کن دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ سالانہ اجتماعات پر اپنے مریدین کی تربیت اور

راہنمائی کے لیے جو خطبات ارشاد فرماتے رہے وہ سب کتابی صورت میں ''چراغ راہ'' کے نام سے اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام کے اغراض و مقاصد تفصیل سے درج کرنے کے علاوہ راہِ سلوک کے پیچ و خم، اس میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا بیان ہے اور صدیوں سے حل طلب رُوحانی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ایسے ایسے نادر نکات بیان کیے گیے ہیں کہ یہ گیارہ خطبات حریمِ ذات کے مسافروں کے لیے منارہ ہائے نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لاہور میں ورودِ مسعود کے بعد آپ کے عقیدت مندوں اور اکتساب فیض کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آپ کی ذات مجسم اخلاق اور سراپا محبت تھی۔ آپ کی محبت کی گیرائی اور گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ہر ملنے والا یہی محسوس کرتا تھا کہ میرے ساتھ آپ بہت پیار کرتے ہیں آپ بڑھاپے اور علالت کے باوجود رُشد و ہدایت کے کام سے کبھی نہ تھکتے۔ صبح سے لے کر رات گئے تک پریم کی محفل برپا رہتی۔ جس میں آپ تشنگانِ محبت کو مئے توحید سے نوازتے اور اللہ کے عشق کی آگ سے سینوں کو گرماتے رہتے۔ آپ نے ۱۹۵۱ء میں اُمتِ مسلمہ کی اصلاح کی یہ تحریک تنہا اور بے سروسامانی کی حالت میں شروع کی تقریباً ربع صدی کی لگا تار محنت اور اللہ کے فضل و کرم کے نتیجے میں آپ تعلیم یافتہ صوفیوں کی ایک منظم جماعت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

جو اُن کی تحریک کو اُن کے آئین کے مطابق آگے بڑھانے میں سرگرم عمل ہے کوئی بزرگ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو آخر کار ایک دن تو اُسے اللہ کے ہاں واپس لوٹنا ہی ہوتا ہے۔ البقاء اللہ آپ بھی مختصر علالت کے بعد ۲۳ جنوری ۱۹۷۷ء کو اپنے خالق و مالک اور محبوبِ حقیقی سے جا واصل ہوئے۔ ہزاروں سوگوار دلوں اور اشکبار آنکھوں نے آپ کو وداع کیا اور آسمان سے اللہ کی رحمت کی برستی پھوار میں لاہور ہی میں سپرد خاک کیے گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ o

سلسلہ توحیدیہ کی وجہ تسمیہ

موجودہ زمانے میں جتنے بھی سلسلے ہیں اُن سبھی میں اِلا ماشاءاللہ پیر پرستی اور قبر پرستی اس قدر

زیادہ ہوگئی ہے کہ اللہ تو کسی کو یاد ہی نہیں آتا۔ قبروں کو سجدے کرنا، اُن سے منتیں ماننا اس قدر عام ہو گیا ہے کہ عوام اِس کو گناہ اور شرک تو کیا برا بھی نہیں سمجھتے۔ زندہ پیروں کی عزت میں اِس قدر غلو بڑھ جاتا ہے کہ نماز کے ادب آداب بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہزاروں پیر صاحبان اپنے مُریدوں سے خود اپنے آپ کو سجدے کرواتے ہیں۔ اِس کا نام انہوں نے سجدہ تعظیمی رکھا ہے اور اُس کو جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ سجدہ سوائے اللہ کے اور کسی کو جائز نہیں۔ یہ لوگ قبر پرستی اور پیر پرستی اور بت پوجا میں اِس قدر غرق ہو گئے ہیں کہ اللہ تو کیا رسول اللہ ﷺ بھی شاذ و نادر ہی یاد آتے ہیں اور جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اِن میں بہت زیادہ تو ایسے ہیں جو حضور ﷺ کو اللہ سے بڑھ کر نہیں تو اِس کے برابر ضرور جانتے ہیں آپ کو لاتعداد ایسے مسلمان ملیں گے جو حضور اکرم ﷺ کو خدا کا اوتار مانتے ہیں یعنی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا خود رسول اکرم ﷺ کی شکل میں زمین پر اُتر آیا تھا۔ حالانکہ اسلام اوتاریت کے عقیدے کو کفر بتاتا ہے۔ الغرض عقائد ہیں تو توحید کے خلاف، رسوم ہیں تو مشرکانہ، اِس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اِس سلسلہ کا نام ہی توحیدیہ رکھوں۔ تا کہ سلسلہ کے ہر مرید کو ہر وقت یہ بات یاد رہے کہ میں بحیثیت ایک سچے مسلمان کے خالص توحید کا ماننے والا ہوں۔ مگر یاد رہے کہ توحیدی سے میری مراد وحدت الوجود ہرگز نہیں۔ ہماری توحید تو سیدھی سادی وہ توحید ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔

ابتدائی ملاقاتیں اور بیعت

(آفتاب احمد خاںؒ)

تعارف! مجالس فقیر کے عنوان کے تحت اب ہمارے مرحوم بھائی آفتاب احمد خاں کے تحریر کردہ واقعات قارئین کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ آفتاب احمد خاں ہمارے بہت ہی پیارے اور بزرگ بھائی تھے۔ آپ کی ملاقات بانی سلسلہ توحیدیہ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ سے 1964ء میں ہوئی جب آپ بنوں کی سکونت ترک کر کے لاہور آ چکے تھے۔ اس سے قبل آپ مرشد کی تلاش میں کئی بزرگوں کے ہاں حاضری دے چکے تھے لیکن جب قبلہ حضرتؒ سے ملے تو اِنہی کے ہو کر رہ گئے۔ پھر پیار اِتنا بڑھا کہ دیکھے بغیر چین نہ آتا اور روزانہ کی حاضری معمول بن گئی۔ اس زمانے میں آپ کے سوا کسی پیر بھائی کے پاس گاڑی نہ تھی اس لیے قبلہ حضرتؒ نے کہیں آنا جانا ہوتا تو مصاحبت کی سعادت بھی خاں صاحب کے حصہ میں آتی۔ راقم الحروف نے خاں صاحب سے گذارش کی کہ آپ کافی عرصہ قبلہ حضرتؒ کے بہت قریب رہے ہیں اس لیے ان مبارک مجالس کا کچھ حال قلمبند فرما دیں تا کہ دوسرے بھائی بھی پریم کی مہک سے اپنی روحوں کو تازہ کر لیں۔ چنانچہ آپ نے زندگی کے بالکل آخری ایام میں علالت اور نظر کی کمی کے باوجود یہ گلدستہ تیار کر دیا اور خود 9 اپریل 1997ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ البقاءللہ تعالیٰ وفات سے پہلے اپنی ڈائری اپنے سعادت مند بیٹے شاہد آفتاب خاں کو دیتے ہوئے وصیت فرمائی کہ اسے ڈار صاحب کے سپرد کر دینا۔ دوسری تاکید یہ فرمائی کہ میرے بعد بھی حلقہ ذکر اس گھر میں جاری رہنا چاہیے اور تیسری وصیت یہ فرمائی کہ میرے مرنے کے بعد یہ قل اور دسویں وغیرہ کی رسمیں ہرگز نہ کرانا خواہ رشتہ دار ناراض ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ چنانچہ آفتاب احمد خاںؒ کی رہائش گاہ واقع 46۔ اورنگزیب بلاک، گارڈن ٹاؤن لاہور پر ہفتہ وار حلقہ ذکر اب بھی جاری ہے اور ان کی ڈائری کے مندرجات آپ کی خدمت میں قسط وار پیش کئے جا رہے ہیں (بقلم محمد صدیق ڈار توحیدی)

فروری 1964ء کے آخری ایام تھے۔ میں کل کی ملاقات سے مطمئن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل و دماغ سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ دفتر میں مجھے محسوس ہوتا رہا کہ جیسے میں زمین

نہیں بلکہ ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ میں حیران تھا کہ میری زندگی کی تمام بے قراریاں اور بے چینیاں اتنی جلدی کیونکر کافور ہو گئیں۔ میں تلاش میں بہت مارا مارا پھرا اور جن جن بزرگوں کے پاس جاتا رہا ان کی ملاقات کا منظر سارا دن میری آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح چل رہا تھا۔ نماز میں خوب دل لگ رہا تھا اور جی چاہتا تھا کہ زیادہ دیر سجدے میں پڑا رہوں۔ دل ایک عجیب روحانی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر چیز بڑی خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ پرندوں کا ہوا میں تیرنا، ان کا چہچہانا، درختوں کی شاخوں کا ہوا میں لہرانا اور جھومنا ایک منفرد کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ یہ بات حقیقت دکھائی دے رہی تھی کہ لوگ سچ ہی کہتے آ رہے ہیں کہ کسی اہل دل یعنی اللہ کے بندے کے ساتھ ایک ساعت کی نشست کئی برسوں کی عبادت پر حاوی ہے۔ اور یہ راز میری زندگی میں ایک نشست ہی سے کھل گیا تھا۔ اب وقت تھا کہ آگے چلتا ہی نہیں تھا حالانکہ دل کی بیتابی کا یہ تقاضہ تھا کہ کل کا دن جلدی آ جائے تا کہ پھر ایک نشست ہو جائے۔ اگلے دن دفتر میں بیٹھا وقت کی گھڑیاں گن رہا تھا کہ میرا ایک دوست آ گیا۔ میں نے قبلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے بارے میں تمام حال کہہ سنایا اور وہ بھی میرے ساتھ جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ پھر ہم دونوں وقت مقررہ پر گاڑی میں بیٹھ کر رائل پارک کے لیے جہاں قبلہ حضرتؒ کا قیام تھا چل دیئے۔ وہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ مطلوبہ کمرہ مقفل تھا۔ اڑوس پڑوس سے پوچھنے پر ایک صاحب نے بتایا کہ صاحب تین چار یوم کے لیے سرگودھا چلے گئے ہیں اور جو بزرگ ان کے ساتھ تھے وہ کینٹ میں اپنے کسی دوسرے مرید کے پاس چلے گئے ہیں، جن کے ایڈریس کے بارے میں کسی کو معلوم نہ تھا۔ اس صورت حال سے بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ واپس آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اب کینٹ چلتے ہیں۔

میرے دوست نے کہا کہ تم بے وقوف ہو گیا؟ چھاؤنی کا اتنا بڑا علاقہ ہے اور ان بزرگوں کا نام اور پتہ تک معلوم نہیں تو کیسے ڈھونڈیں گے۔ میں نے بے ساختہ کہہ دیا کہ کینٹ ضرور چلیں گے اگر سچا پیر ہے تو خود ہی کھینچ لے گا ورنہ خوار ہو کر واپس آ جائیں گے۔ چنانچہ ہم کینٹ ایریا میں چلے گئے۔ بے خیالی میں ایک دو موڑ ہی موڑے تھے کہ ایک کوٹھی کے گیٹ سے میں نے دیکھا کہ ایک برآمدے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ میرا دل اٹک گیا کہ کوٹھیوں والے صاحب لوگ اس طرح چارپائی نہیں ڈالتے۔ یہاں ضرور کسی فقیر کا ڈیرہ ہے۔ میں نے گاڑی روک کر گھنٹی بجائی تو ایک نوکر باہر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس حلیئے کے ایک بزرگ رائل پارک سے

منتقل ہوکر یہاں تو نہیں آئے۔ اس نے کہا کہ یہاں ہی آئے ہیں۔ آپ دوسری جانب کے
گیٹ سے اندر آ جائیں۔ اس طرح اللہ نے سچے فقیر سے ملاقات کے لئے خود ہی ہماری راہنمائی
فرمائی۔ یوں تو پہلے روز کی ملاقات ہی دل پر گہرا اثر چھوڑ گئی تھی مگر آج بغیر کسی پتہ کے ملاقات ہو
جانے کا واقعہ سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ میں اِس پر کافی سوچ بچار کرتا رہا آخر ایک دن حضرت
صاحب نے خود ہی فرمایا کہ جس کو جہاں کہیں سے حصہ ملنا ہوتا ہے وہ وہاں خود ہی پہنچ جاتا ہے۔
اِس طرح قبلہ حضرتؒ کے ہاں آنا جانا معمول کا ایک حصہ بن گیا۔ یہ امر بھی حضرتؒ کے پیار اور
شفقت کے سبب تھا کہ میں زیادہ بے قرار رہنے لگا۔ جی چاہتا تھا جلد از جلد اِن کا مرید بن جاؤں
اور بیعت کے بندھن میں بندھ ہو جاؤں۔ کبھی کبھی میں اِس خواہش کا اظہار بھی کر دیتا لیکن اِن
کی طرف سے ہلکی سی مسکراہٹ اور کچھ ٹال مٹول کا ہی اظہار ہوتا۔ اِس طرح کے انداز سے میں
اور بے چین ہو جاتا اور سوچتا کہ شاید ابھی میرا معیار ایسا نہیں ہے حالانکہ میں دل سے سلسلہ کی
تعلیم کو تسلیم کر چکا تھا۔ ایک دن حضرت قبلہؒ سے جمعرات کے حلقہ ذکر کی دعوت ملی۔ میں نماز عصر
کے بعد حاضر ہو گیا، نماز مغرب کے بعد ذکر شروع ہوا۔ میرے لئے یہ پہلا تجربہ تھا۔ کمرے کی
لائٹ بند کر دی گئی۔ اِس تاریکی میں چند لمحوں نے عجیب خاموشی طاری کر دی اور مجھے یوں لگا جیسے
دنیا کی ہر چیز ذہن سے غائب ہو گئی اور دل و دماغ اللہ کی یاد کیلئے تیار ہو گیا ہے۔ پھر خادم حلقہ نے
آہستہ سے بسم اللہ سے ذکر کا آغاز کیا تو سب بھائیوں نے باآواز بلند درود پاک پڑھنا شروع کیا
مجھے ایسے محسوس ہوا کہ حضور ﷺ کا روضہ مبارک میرے سامنے ہے اور میں خاموشی کے ساتھ سر
جھکائے ہل کر پڑھے جانے والا درود شریف سن رہا ہوں۔ پھر سبحان اللہ کی آواز پر سب بھائیوں
نے درود پاک پڑھنا بند کر دیا۔ اب لا اِلٰہ الا اللہ کا ذکر شروع۔ ایک مرتبہ پھر ایسا محسوس ہوا کہ
سب لوگ دیوانہ وار خانہ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں اور کسی کو کوئی ہوش نہیں ہے۔ اس طرح تقریباً
ایک گھنٹہ تک میں طرح طرح کی کیفیات سے محظوظ ہوتا رہا۔ قبلہ حضرتؒ نے ذکر کے بعد
دریافت فرمایا کہ ذکر اچھا لگا؟ میں نے عرض کیا کہ خوب لطف اُٹھایا۔ پھر پوچھا کہ مختلف اذکار میں
سے کونسا ذکر پسند آیا۔ میں نے فوراً کہہ دیا "جناب! سب سے زیادہ مالک الملک لاشریک لہ
وحدہ لا اِلٰہ اِلا ھو پسند آیا، قبلہ حضرت نے مسکراتے ہوئے عجب انداز سے دونوں ہاتھوں سے تالی
بجائی اور فرمایا! "خوب! تو تو پہلے ہی توحیدی ہے" وقت گذرتا گیا اور میری ملاقاتوں کا معمول بھی
زیادہ ہوتا چلا گیا۔ مجھے ایسے لگتا جیسے ایک غیر مرئی مقناطیسی طاقت کے زیرِ اثر حضرت صاحب کی
طرف کھنچا چلا جاتا ہوں۔ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ میں اپنے تمام معمولات کو بھول کر قبلہ حضرتؒ کی

ملاقات اور دید کو ہر لحاظ سے ترجیح دینے لگا۔ ایک دن بیعت کے لئے پھر گذارش کی تو فرمانے لگے یہ کوئی ضروری تو نہیں ہے بیعت کے بغیر بھی فیض ملتا رہے گا۔ تمہارے ساتھ ہماری دوستی ہے۔ بس دوست دوست کو ملتا رہے۔ میں اپنے سامنے لوگوں کو بیعت ہوتے دیکھتا تھا آخر مجھے انکار کیوں؟ اس رات میں سو نہ سکا۔ رات کے پچھلے پہر ذرا آنکھ لگی تو مجھے ایسے محسوس ہوا کہ میرا پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب پھٹا کہ پھٹا۔ لیکن عین اس وقت ایک ہاتھ ظاہر ہوا اور میرے پیٹ پر رکھ دیا گیا۔ اِس ہاتھ کے لگتے ہی میرے پیٹ کی ہوا خارج ہو گئی اور میں نارمل محسوس کرنے لگا۔ فجر کی نماز کانوں میں سنائی دی تو میں خواب سے بیدار ہوا، نماز ادا کی اور کچھ دیر کے بعد دوبارہ سو گیا۔ اب کی دفعہ خوب گہری نیند آئی۔ معمول کے مطابق 9:30 بجے قبلہ حضرتؒ کے ہاں حاضر ہوا۔ حضرتؒ آج زیادہ ہی شفقت اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ سے کچھ سننے کیلئے تیار ہیں میں نے رات والے خواب کے بارے میں عرض کرنا شروع کیا تو جب میں اپنی زبان پر ''ہاتھ'' کا لفظ ابھی لایا ہی تھا تو آپ نے فوراً فرمایا کہ وہ تو میرا ہی ہاتھ تھا اور ساتھ ہی خادم کو آواز دی اور فرمایا کہ مہمانوں کے لئے مٹھائی لاؤ، اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے کہ تم بیعت ہونے کیلئے بہت بے قرار ہو۔ میں نے تمہیں پہلی ملاقات میں ہی بیعت کر لیا تھا آج تمہارے اطمینان کے لئے رسماً بیعت کرتا ہوں۔ بیعت کرنے کے بعد مٹھائی کا ایک ٹکڑا لیا اور پہلے اپنے منہ میں ڈال کر اِس کا آدھا حصہ مجھے دے دیا اور بڑی ہی خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ تمہیں بیعت کر کے یوں بھی مجھے بڑی خوشی اِس لئے ہوئی ہے کہ تم بے بنائے میرے پاس آئے ہو۔ مجھے تم پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ سلسلہ توحیدیہ میں تمہاری شمولیت ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اور میری کیفیت ایسی تھی جیسے منوں بوجھ دل و دماغ سے اُتر گیا ہو۔ دل شگفتہ اور بدن ہلکا ہو گیا اور میں سارا دن گویا ہوا کے دوش پر تیرتا رہا رات کو نیند میں بڑے بڑے بزرگوں کے مزارات پر حاضری ہوتی رہی اور آنسوؤں کی جھڑیاں لگتی رہیں۔ فجر کے وقت جب میں بیدار ہوا تو میرا تکیہ بھیگا ہوا تھا اور طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ یہ ایک نئی زندگی کے دوسرے دن کا آغاز تھا۔

رسول اکرم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کس لئے کیا جائے؟

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

۱۔ رسول کریم ﷺ کی سیرت یعنی سوانح حیات وتعلیمات کا مطالعہ اب بھی کیوں کیا جائے جب کہ آپ کی وفات پر کوئی چودہ صدیاں گزر چکی ہیں، علوم وفنون میں بے انتہا ترقی ہو چکی ہے، متمدن قوموں کے ماحول، اور تصور حیات میں زمین وآسمان کا فرق ہو چکا ہے اور آپ بھی ہمارے جیسے ایک انسان تھے؟

۲۔ یہ سوال ہر سنجیدہ طالب علم، اور ذاتی غور وفکر کر کے ذمہ دارانہ اور مستقل رائے قائم کرنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اصولی حد تک تو اِس سے کسی کو انکار نہیں ہوتا کہ انسانی تمدن کی ترقی کا راز اِس پر مبنی ہے کہ "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" البتہ اِس طرح نہیں کہ اُدھیڑ بُن کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ (**کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انکاثا** ۔قرآن ۱۶/۹۲، کات کات کر خود ہی تار تار کرنے والی عورت کی طرح) جاری رکھا جائے، ظاہر ہے کہ قدیم و جدید دونوں عمارتوں کا مالک متمول تر ہوگا۔ بہ نسبت اِس شخص کے جس کے قبضے میں صرف ایک عمارت ہو۔ البتہ یہ سوال ایک تفصیلی جواب چاہتا ہے کہ خاص محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا کیوں مطالعہ کیا جائے، کسی اور کی سیرت کا کیوں نہیں؟

۳۔ اس سوال کے جواب میں بعض باتیں صرف مسلمانوں سے متعلق ہیں، بعض غیر مسلموں سے اور بعض بلا امتیاز ہر کسی سے۔

مسلمانوں کے لئے :۔ سرور کائنات ﷺ کی سیرت جو اہمیت رکھتی ہے وہ کسی لمبی تفصیل کی محتاج نہیں ہے، اسلامی قانون اور عقائد کا یہ ایک مسلمہ کلیہ قاعدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ہر قول اور ہر فعل حتیٰ کہ اپنے صحابہ میں ہر گوارا کی اور روا رکھی ہوئی چیز قانونی حیثیت رکھتی ہے اور قرآن یا کلام اللہ کی طرح سنت نبویؐ سے بھی واجبات، مستحبات، مباحات، مکروہات، محرمات وغیرہ قائم ہوتے ہیں۔

۴۔ یوں تو کسی مسلمان کی زندگی اصل میں صرف اسی وقت اسلامی کہلا سکتی ہے، جب

قرآن مجید کے احکام کے عین مطابق ہو، لیکن خود قرآنِ مجید میں بہ کثرت موقعوں پر نہایت صاف وصریح الفاظ میں سنت نبویؐ کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا گیا اور اُسے واجب التعمیل قرار دیا گیا ہے۔ اِس سے سنت یا سیرتِ نبویؐ کی حیثیت بھی جز قرآن نہیں تو کم از کم ضمیمہ قرآن اور تتمہ قرآن کی ہو جاتی ہے۔ ایسی چند قرآنی آیتوں کی طرف یہاں توجہ منعطف کرائی جاسکتی ہے۔

(الف) مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ ۵۹/۷

رسول تم کو جو دے وہ لے لو، اور جس سے وہ تم کو روکے تو رُک جاؤ۔

(ب) مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى۔ ۵۳/۴۳

(آنحضرتؐ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے مگر وہ (خدا ہی کی) بھیجی ہوئی وحی ہوتی ہے۔

(ج) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۴/۸۰

جو رسول کی اطاعت کرے تو وہ اللہ کی اطاعت ہے۔

۵۔ ان اور دیگر آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ سرورِ کائنات کی سیرت کو نمونہ سمجھنا اور اس پر عمل کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود احکامِ خداوندی پر۔

غیر مسلموں کیلئے! سیرتِ نبویہ کا مطالعہ اِس لئے ضروری ہے کہ جب ایک شخص ہم سے بیان کرے کہ میں تمہارے فائدے کی کچھ بات بے غرضانہ طور سے کہنا چاہتا ہوں تو کون سی عقلِ سلیم رکھنے والا ایسا ہوگا جو سننے سے پہلے یہ فیصلہ کرے کہ وہ بات سننے کے قابل نہیں؟ آنحضرتؐ نے جب یہ فرمایا کہ میں تمام عالموں کے لئے رحمت بن کر آیا ہوں اور میرے لائے ہوئے دین اسلام کے بغیر دنیا و آخرت کی بھلائی حقیقت میں حاصل ہی نہیں ہوسکتی، تو اِس پر اوچھی طبیعت والوں نے ٹھٹول شروع کیا یا مخالفت پر اُتر آئے۔ اِس کے برخلاف سنجیدہ لوگوں نے یہ پوچھا کہ اسلام کس کو کہتے ہیں اور آپ کی رائے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ پھر جواب اور توضیح پر سچے دل سے غور کیا۔ اور جس کی دانست میں بات معقول تھی، اُس نے اس دین کو قبول کرلیا۔

۶۔ ہادی اسلامؐ کے اقوال وافعال اور آپؐ کی تعلیم اب تک محفوظ و موجود ہے اور محض آثار کی رتی سے ہاتھی بنانے اور قیاس آرائی و خوش عقیدگی کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں بھی:۔

۸۔ ہر کسی کیلئے چند بنیادی اصول سے خود فیصلہ کر لینا ممکن ہے۔ چونکہ اسلام کا اصل اصول یہ ہے کہ۔

فِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَّ فِی الاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔ قرآن ۲/۲۰۱

یعنی دنیا میں بھی اچھے رہیں اور آخرت میں بھی۔

اولاً ہم یہی دیکھیں گے کہ دنیوی معاملات میں آنحضرتؐ کی سیرت اور طرزِ تعلیم میں ہمارے لئے کیا سبق ہیں؟

۹۔ دنیا میں یک حیثیتی لوگوں کی کمی نہیں۔ لیکن اگر ہم مثلاً سکندرِ اعظم اور نپولین و ہٹلر کو لیں تو اُن کی زندگی صرف ایک سپہ سالار اور فاتح کیلئے مفید مطالعہ ثابت ہو سکتی ہے اور بس۔ گوتم بدھ کی زندگی، ریاضت اور عبادت میں خصوصی دلچسپی لینے والوں ہی کیلئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ ہومر صرف ایک شاعر اور قصہ گو تھا۔ افلاطون وارسطو صرف حکیم و فلسفی تھے، زندگی کے دوسرے شعبوں میں اُن کی کوئی بڑی وقعت نہیں۔ خاص کر اکثر ناصح بے عمل رہے۔

۱۰۔ اس کے برخلاف پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی قول و فعل کی یکسانی، ہمہ جہتی حیثیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی ہی میں کامیابی کے لحاظ سے ایک بے مثل چیز ہے کہ دعویٰ بھی ہے اور اس کا ثبوت بھی۔

۱۱۔ چنانچہ سیاسی پہلو کو لیجئے تو آپ نے دس سال کے قلیل عرصے میں جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین اور جنوبی عراق میں نراج (لاحکومتی) کی جگہ۔ جہاں زیادہ تر خودسر، خانہ بدوش، قبائل میں خانہ جنگیاں ہی رہا کرتی تھیں، ایک مستحکم اور بڑی مملکت قائم کر دی۔

۱۲۔ بہ حیثیت سپہ سالار کے آپ کی لڑائیوں میں بہ مشکل چند سو آدمی فریقین کے مارے گئے لیکن دس سال میں دس بارہ لاکھ مربع میل کا رقبہ مطیع اور ماتحت ہو گیا۔ پھر یہ آپؐ ہی کے تربیت یافتہ تھے جن سے زیادہ "مہذب وحشی" کبھی فتوحات کے لئے نہیں نکلے اور جن سے زیادہ تیز اور ٹھوس فتوحات کا اگلوں پچھلوں کسی نے ریکارڈ قائم نہیں کیا۔

۱۳۔ بہ حیثیت منتظم و مدبر کے ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے جہاں

صحیح معنوں میں کبھی کوئی مملکت قائم ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود آپ نے جو دستورِ مملکت وضع اور جو نظام حکمرانی قائم فرمایا۔ اب یہ عمل دنیا کی اس عظیم الشان مملکت کے لئے نہ صرف بہترین کارنامہ ثابت ہوا بلکہ جب تک اس پر عمل رہا، وہ دنیا کی مہذب ترین حکومت بنی رہی۔ انسانیت کا دورِ زرین کہنا مبالغہ نہیں۔

۱۴۔ عمرانی حیثیت سے تقسیم و گردشِ دولت کا اصول سرورِ کائنات کے ہر مالی حکم میں نظر آتا ہے۔ تقسیم ترکہ، تحریرِ وصیت، ممانعت سود، دولت صرف مالداروں میں نہ گھومتی رہے اور مالداروں سے لئے ہوئے محصول سے حکومت اپنی رعایا میں سے تمام غریب و مسکین افراد کو روٹی مہیا کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھے۔ عورت، غلام، مزدور وغیرہ کے متعلق بھی اسلامی احکام تمام قوموں کیلئے آئیڈیل ہیں۔

۱۵۔ سماجی اور اخلاقی حیثیت سے آپ نہ صرف معلم اخلاق تھے۔ بلکہ اپنی تعلیم پر سب سے پہلے عمل کرتے اور دوسروں کو جتنا حکم دیتے، اس سے کہیں زیادہ خود انجام دیتے۔ ایک باپ، ایک شوہر، ایک حاکم، ایک دوست، ایک تاجر و شریک تجارت، غرض ہر حیثیت سے آپ کا کردار اتنا بے داغ ہے کہ دشمن تک کو اس کے سراہے بغیر چارہ نہیں۔ علاوہ اور مسلمہ بھائیوں کے شراب نوشی اور بت پرستی کی ممانعت مسلمانوں کی ایسی خصوصیات ہیں کہ دنیا اب اس کو خواہی نخواہی ماننے پر مجبور ہے۔

۱۶۔ دنیا میں بہت سے ہادی، معلم اور پیغمبر آئے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کسی کو اپنی زندگی میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جو نبی عربی کو ہوئی۔ سن ۱۰ھ میں جب آپ حج کو تشریف لے گئے تو آپ کے ساتھ ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان تھے، جو برِاعظم عرب کے ہر حصے سے آئے تھے۔

۱۷۔ آنحضرت نے جو دین پیش فرمایا، اس نے اپنے لئے خود بخود جگہ پیدا کر لی۔ چین میں جہاں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی، مگر وہاں بھی کروڑوں مسلمان ہیں۔ یورپ و ہندوستان و افریقہ میں غیر مسلم حکومتوں کی موجودگی میں اور اپنے مذہب کے پھیلانے کے نئی اور منظم تدابیر عمل میں لانے کے باوجود نومسلموں کی روز افزوں کثرت ہے۔ کمیونسٹ

علاقوں میں بھی نومسلم نظر آرہے ہیں، جو اِس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ اسلام کی اندرونی کشش کتنی ہے۔

۱۸۔ وہ آپؐ ہی تھے کہ قسم قسم کے تعصبات سے لبریز دنیا میں برملا فرما گئے کہ نسل، رنگ، زبان، جغرافیائی سکونت سے کسی انسان کو دوسرے پر قطعاً کوئی فوقیت نہیں۔ حقیقی فضیلت بس نکو کاری اور خدا ترسی ہے۔

اِن اکرمکم عندا للہ اتقاکم○

خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہیں

آپؐ نے اس اصول پر جس زور سے عمل کرایا اُسی کا نتیجہ ہے کہ تمام پست اور مظلوم قومیں اسلام ہی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتی رہی ہیں۔ اسلام سے زیادہ مساوات کسی اور مذہب میں نظر نہیں آتی۔ اور فطرت کی تنوع پسندی کے باعث بین الاقوامی تعلقات کا حل اسلام کے سوا کسی ذریعے سے ممکن بھی نظر نہیں آتا۔

۱۹۔ یہ دنیوی پہلو تھا۔ اسلام کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ دین و دنیا دونوں کی بہ یک وقت بھلائی چاہتا ہے۔ روحانی ترقی اور تزکیہ نفس کے لئے توحید سے بڑھ کر کوئی وسیلہ نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی شخص خدا کو ایک مان لے اور خیر و شر اُس کے سوا کسی اور کی قدرت میں نہ سمجھے اور حشر و نشر کو مان لے تو پھر اس سے گناہ کا سرزد ہونا محال نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے۔ ہر شخص کے ایمان کی پختگی اِس کے اعمال میں ہویدا رہتی ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد فی سبیل اللہ ایسے احکام ہیں جن سے انسان فرشتوں سے بھی سبقت لے جاتا ہے۔ جس میں عدول حکمی کی صلاحیت ہی نہ ہو اور کسی کل کی طرح حرکت کرتا چلا جائے وہ نہ تو ثواب کا مستحق ہے اور نہ عذاب کا مستوجب، جس میں خیر و شر کی قدرت بیک وقت ہو اور وہ اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر صرف خیر پر عمل کرے، یقیناً وہی اشرف المخلوقات ہے۔

۲۰۔ مختصراً یہی وہ چیزیں ہیں جو رسولِ عربیؐ کی سیرت میں ہم کو نظر آتی ہیں۔ ان کا سنجیدہ اور غیر جانبدار مطالعہ ہیں۔ ہمیں اِن کو اسوہ حسنہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں چھوڑتا۔

۲۱۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین○۔

وحی اور اُس کی حقیقت

(مولانا محمد تقی عثمانی)

قرآن کریم چونکہ سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا ہے، اس لئے سب سے پہلے ''وحی'' کے بارے میں چند باتیں جان لینی ضروری ہیں۔

وحی کی ضرورت! ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اِس دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کر کے پوری کائنات کو اِس کی خدمت میں لگا دیا ہے، لہٰذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کیلئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اِس کائنات سے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، ٹھیک ٹھیک کام لے اور دوسرے یہ کہ اِس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کے احکام کو مدنظر رکھے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

اِن دونوں کاموں کیلئے انسان کو ''علم'' کی ضرورت ہے اس لئے جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اِس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟ اِن سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا نیز جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کونسے کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتا ہے، اس وقت تک اِس کیلئے اللہ کی مرضی پر کاربند ہونا ممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعے اِسے مذکورہ باتوں کا علم ہوتا رہے، ایک انسان کے حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، منہ اور ہاتھ پیر دوسرے عقل اور تیسرے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی چیزیں اپنے حواس کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں ان کا علم وحی کے ذریعہ عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے اِن تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں، ان کا علم نری عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً اس وقت میرے سامنے ایک انسان بیٹھا ہے، مجھے

اپنی آنکھ کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ انسان ہے، آنکھ ہی نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اِس کا رنگ گورا ہے، اس کی پیشانی چوڑی، بال سیاہ، ہونٹ پتلے اور چہرہ کتابی ہے، لیکن اگر یہی بات میں اپنے حواس کو معطل کر کے محض عقل سے معلوم کرنا چاہوں، مثلاً آنکھیں بند کر کے یہ چاہوں کہ اس انسان کی رنگت، اس کے اعضاء کی صحیح صحیح بناوٹ اور اس کی سراپا ٹھیک ٹھیک تصویر مجھے صرف اپنی عقل کے ذریعہ معلوم ہو جائے تو یہ ناممکن ہے۔

اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہو سکتیں، مثلاً اِسی شخص کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اِس کی کوئی نہ کوئی ماں ضروری ہے، نیز یہ بھی علم ہے کہ اُسے کسی نے پیدا کیا ہے، اگرچہ نہ اِسکی ماں اس وقت میرے سامنے ہے، نہ میں اِس کے پیدا کرنے والے کو دیکھ سکتا ہوں، لیکن میری عقل کے بجائے، اپنی آنکھ سے حاصل کرنا چاہوں تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ اِس کی تخلیق اور پیدائش کا منظر اب میری آنکھوں کے سامنے نہیں آ سکتا۔

غرض جہاں تک حواسِ خمسہ کا تعلق ہے وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی اور جہاں حواس خمسہ جواب دیدیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے لیکن اِس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رُک جاتی ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اِسی شخص کے بارے میں عقل نے یہ تو بتا دیا کہ اِسے کسی نے پیدا کیا ہے، لیکن اس شخص کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس کے ذمہ خدا کی طرف سے کیا فرائض ہیں؟ اِس کا کونسا کام اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور کونسا ناپسند؟ یہ سوالات ایسے ہیں کہ عقل اور حواس مل کر بھی ان کا جواب نہیں دے سکتے، اِن سوالات کا جواب انسان کو دینے کیلئے جو ذریعہ اللہ نے مقرر فرمایا ہے اِسی کا نام ''وحی'' ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ ''وحی'' انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اِسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہوتے۔ لیکن اُن کا علم حاصل کرنا اِس کے لئے ضروری ہے اور مذکورہ تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کیلئے کافی نہیں بلکہ اِس کی ہدایت کے لئے وحی الٰہی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل

کام نہیں دیتی، اِس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے اِسی طرح بہت سے دینی معتقدات کا علم دینا عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے اور اِن کے ادراک کیلئے محض عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔

وحی کا مفہوم اِس تمہید کو ذہن میں رکھ کر ''وحی'' کے مفہوم اور اِس کی حقیقت پر غور فرمائیے۔ ''وحی'' اور ''ایحا'' عربی زبان کے الفاظ ہیں اور لغت میں اُن کے معنی ہیں ''جلدی سے کوئی اشارہ کر دینا'' خواہ یہ ارشارہ رمز د کنایہ استعمال کر کے کیا جائے، خواہ کوئی بے معنی آواز نکال کر، خواہ کسی عضو کو حرکت دے کر، یا تحریر و نقوش استعمال کر کے، ہر صورت میں لغۃً اِس پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں۔

چنانچہ اِسی معنی میں حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

فخرج علی قومه من المحراب فاوحی الیهم ان سبحوا بکرة وعشیا۔ (مریم۔۱۱)

''پس وہ اپنی قوم کے سامنے محراب سے نکلے اور انہیں اشارہ کیا کہ صبح و شام تسبیح کرتے رہا کرو''

پھر ظاہر ہے کہ اس قسم کے اشارے سے مقصد یہ ہی ہوتا ہے کہ مخاطب کے دل میں کوئی بات ڈال دی جائے، اس لئے لفظ ''وحی'' اور ''ایحا'' دل میں کوئی بات ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا، چنانچہ قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں یہی معنی مراد ہیں، مثلاً

واوحی ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا۔ (النحل۔۶۷)

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنالے یہاں تک کہ شیاطین دلوں میں جو وسوسے ڈالتے ہیں اُن کیلئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، ارشاد ہے:۔

وکذلك جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضهم الی بعض۔ (انعام۔۱۱۲)

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کیلئے ایک نہ ایک دشمن ضرور پیدا کیا ہے، جن وانس کے شیاطین (میں سے جو) ایک دوسرے کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں''۔

نیز ارشاد ہے:۔

وان الشیاطین لیوحون الی اولیاءِ ھم لیجادلوکم۔

''اور بلاشبہ شیطان اپنے دوستوں کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں، تاکہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں''۔ (الانعام:۱۲۱)

اللہ تعالیٰ فرشتوں سے جو خطاب فرماتے ہیں اس کو بھی ''ایحا'' کہا گیا ہے:۔

اذا یوحی ربك الی الملئِکة انی معکم۔ (الانفال۔۱۲)

''جب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اطلاع دیتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں''۔

کسی غیر نبی کے دل میں جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے اس کو بھی اسی لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

وَاوحینا الی اُم موسی ان ارضعیه (القصص۔۷)

''اور ہم نے موسیٰؑ کی والدہ کو الہام کیا کہ اِس کو دودھ پلاؤ''۔

لیکن یہ سب اِس لفظ کے لغوی مفہوم ہیں، شرعی اصطلاح میں ''وحی'' کی تعریف یہ ہے۔

کلام اللّٰہِ المنزل علی نبی من انبیا ئِه

''اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اِس کے کسی نبی پر نازل ہو''۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ لفظ ''وحی'' اپنے اصطلاحی معنی میں اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ اب اسکا استعمال پیغمبر کے سوا کسی اور کے لئے درست نہیں، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری فرماتے ہیں ''وحی'' اور ''ایحا'' دونوں الگ الگ لفظ ہیں اور دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، ''ایحا'' کا مفہوم عام ہے اور انبیاء پر وحی نازل کرنے کے علاوہ کسی کو اشارہ کرنا اور کسی غیر نبی کے دل میں کوئی بات ڈالنا بھی اِس کے مفہوم میں داخل ہے، لہٰذا یہ لفظ نبی اور غیر نبی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اِس کے برخلاف ''وحی'' صرف اُس الہام کو کہتے ہیں جو انبیاء پر نازل ہو، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے لفظ ''ایحا'' کا استعمال تو انبیاء اور غیر انبیاء دونوں کیلئے کیا ہے، لیکن ''وحی'' سوائے انبیاء کے کسی اور کے لئے استعمال نہیں فرمایا۔

بہر کیف، ''وحی'' وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنا کلام اپنے کسی منتخب بندے اور رسول تک پہنچاتا ہے اور اس رسول کے ذریعہ تمام انسانوں تک، اور چونکہ ''وحی'' اللہ اور اِس کے بندوں کے درمیان ایک مقدس تعلیمی رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا مشاہدہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کو ہوتا ہے، اِس لئے ہمارے لئے اِس کی ٹھیک ٹھیک حقیقت کا ادراک بھی ممکن نہیں، البتہ اِس کی اقسام اور کیفیات کے بارے میں کچھ معلومات خود قرآن وحدیث نے فراہم کی ہیں۔ یہاں صرف اِنہی کو بیان کیا جاسکتا ہے:۔

وحی کی تعلیمات وحی کے ذریعہ بندوں کو اُن باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے جو وہ محض اپنی عقل اور حواس سے معلوم نہ کرسکیں، یہ باتیں خالص مذہبی نوعیت کی بھی ہوسکتی ہیں، اور دنیا کی عام ضروریات بھی انبیاء علیہم السلام کی وحی عموماً پہلی قسم کی ہوتی ہے، لیکن بوقت ضرورت دنیوی ضروریات بھی بذریعہ وحی بتائی گئی ہیں، مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہے:۔

واصنع الفلك باعيننا ووحينا (ھود۔۲۷)

''کشتی ہمارے سامنے ہماری وحی کے ذریعہ بناؤ''

اِس سے معلوم ہوا کہ انہیں کشتی کی صنعت بذریعہ وحی سکھائی گئی، اِسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھائی گئی، نیز حضرت آدم علیہ السلام کو خواص اشیاء کا علم بذریعہ وحی دیا گیا، بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ علم طب بنیادی طور پر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔

وحی کی اقسام! حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ وحی کی ابتداء تین قسمیں ہوتی ہیں:۔

(۱) وحی قلبی! اِس قسم میں باری تعالیٰ براہِ راست نبی کے قلب کو مسخر فرما کر اِس میں کوئی بات ڈال دیتا ہے، اِس قسم میں نہ فرشتہ کا واسطہ ہوتا ہے اور نہ نبی کی قوت سامعہ اور حواس کا، لہٰذا اِس میں کوئی آواز نبی کی سنائی نہیں دیتی، بلکہ کوئی بات قلب میں جاگزین ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، یہ کیفیت بیداری میں بھی ہوسکتی ہے اور خواب میں بھی، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم اِسی طرح دیا گیا تھا۔

۲۔ کلام الٰہی! اِس دوسری قسم میں باری تعالیٰ براہِ راست رسول کو اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرماتا ہے، اِس میں بھی کسی فرشتہ کا واسطہ نہیں ہوتا، لیکن نبی کو آواز سنائی دیتی ہے، یہ آواز مخلوقات کی آواز سے بالکل جدا ایک عجیب وغریب کیفیت کی حامل ہوتی ہے، جس کا ادراک عقل کے ذریعہ ممکن نہیں، جو انبیاء اُسے سنتے ہیں وہی اِس کی کیفیت اور اس کے سرور کو پہچان سکتے ہیں۔

وحی کی اِس قسم میں چونکہ باری تعالیٰ سے براہِ راست ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، اِس لئے یہ قسم وحی کی تمام قسموں میں سب سے افضل اور اعلیٰ ہے، اِسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت بیان کرتے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وکلمه الله موسى تكليما۔(النساء۔۱۶۳)

''اور اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے خوب باتیں کیں''۔

(۳) وحی ملکی! اِس تیسری قسم میں اللہ تعالیٰ اپنا پیغام کسی فرشتہ کے ذریعے نبی تک بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ پیغام پہنچاتا ہے، پھر بعض اوقات یہ فرشتہ نظر نہیں آتا، صرف اِس کی آواز سنائی دیتی ہے اور بعض مرتبہ وہ کسی انسان کی شکل میں سامنے آ کر پیغام پہنچا دیتا ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نبی کو اپنی اصلی صورت میں نظر آ جائے لیکن شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے وحی کی اِنہی تین قسموں کی طرف آیت ذیل میں اشارہ فرمایا ہے۔

ماكان لبشر ان يكلمه اللهُ الا وحيا اومن وراء حجاب اويرسل رسولاً فيوحى باذنه مايشاء۔(الشوریٰ ۔۵۱)

''کسی بشر کیلئے ممکن نہیں کہ اللہ اِس سے (روبرو ہوکر) بات کرے، مگر دل میں ڈال کر یا پردے کے پیچھے سے یا کسی پیغامبر (فرشتے) کو بھیج کر جو اللہ کی اجازت سے جو اللہ چاہے وحی نازل کرے''۔

اس آیت میں **وحیا** (دل میں بات ڈالنے) سے مراد پہلی قسم یعنی وحی قلبی ہے اور پردے کے پیچھے سے مراد دوسری قسم یعنی کلام الٰہی اور پیغامبر بھیجنے سے مراد تیسری قسم یعنی وحی ملکی ہے۔

اطاعتِ رسول کی حدود

(مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری)

قرآنِ پاک میں اطاعت رسول پر بار بار اتنا زور دیا گیا ہے کہ معمولی مسلمان بھی اس سے بے خبر نہیں۔ اِس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ۔

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ

جو رسول کی اطاعت کرے گا وہ عین اللہ ہی کی اطاعت ہوگی۔

اور یہ کلیہ ہر رسول کے ساتھ وابستہ ہے جیسا کہ ارشاد ہوا۔

وما ارسلنا من قبلك من رسول الا ليطاع باذن الله

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجا وہ اِسی لئے کہ اللہ کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے۔

پھر بیشتر جگہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ ہی رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔

ایک آیت میں تین اطاعتوں کا بھی ذکر ہے۔

اطیعواللہ واطیعوالرسول واولی الامرمنکم۔

اللہ کی اطاعت کرو نیز رسول اور اپنے اولی الامر کی بھی اطاعت کرو۔

یہاں قدرتاً ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ تین تین اطاعتیں کیسی ہیں؟ کیا اطاعت الٰہی، اطاعت رسول اور اطاعت اولی الامر تینوں کی ایک ہی حیثیت ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اِسے شرک فی الطاعت نہ کہا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اگر اِن تینوں اطاعتوں کی حیثیت ایک ہی ہو تو اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعتوں میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ یقیناً یہاں سب میں کچھ فرق ہوگا اور ہر ایک کی اطاعت کی کچھ الگ حدود ہوں گی۔

یہاں خاص طور پر زیرِ غور مسئلہ اطاعتِ رسولؐ ہے کہ اِس کی کیا حیثیت ہے؟ اگر یہ اطاعت اللہ کی اطاعت کی طرح ہے تو اللہ اور رسول کی اطاعتوں میں کیا فرق ہے؟ اور اگر یہ اطاعت

اولی الامر کی اطاعت جیسی ہے تو رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعتوں میں کیا فرق ہوا، خصوصاً جب کہ اس آیت میں اللہ کی اطاعت کو الگ اور رسول کی اطاعت کو اولی الامر کی اطاعت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے؟

اللہ کی اطاعت ہر مسلمان پر غیر مشروط طریقے پر فرض ہے۔ اس میں کسی بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اولی الامر کی اطاعت غیر مشروط نہیں۔ آنحضرتؐ نے اولی الامر کی اطاعت کی حدود یوں واضح طور پر بتادی ہیں کہ:۔

لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔

کسی مخلوق کی اطاعت وہاں نہیں ہوگی جہاں خالق کی نافرمانی ہوتی ہو۔

ہمیں ایسی نظیریں بھی ملتی ہیں کہ اطاعت امیر کی ہزار تاکیدوں کے باوجود بعض اوقات امیر کی نافرمانی کی گئی۔ کیونکہ اِسے اطاعت الٰہی کے خلاف سمجھا گیا۔ اور آنحضرتؐ نے اِس نافرمانی پر اظہار رضامندی بھی فرمایا۔ ایک امیر نے اپنے مامور کو بطور سزا آگ میں گھس جانے کا حکم دیا۔ اُس نے انکار کیا۔ آنحضرت ﷺ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو فرمایا۔ تم نے اچھا کیا جو آگ میں نہ گئے ورنہ اس میں سے کبھی نکل نہ سکتے۔ (یعنی ہمیشہ کیلئے دوزخ میں چلے جاتے)

اب غور طلب مسئلہ یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ بہر حال مخلوق ہی ہیں خالق نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کی اطاعت کی بھی یقیناً کچھ حدود ہوں گی۔ اور آپ کی اطاعت، اطاعت الٰہی کی طرح غیر مشروط نہ ہوگی۔ لیکن یہ مان لینے کے بعد بھی یہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا کہ آنحضرتؐ کی اطاعت اِسی نوعیت سے مشروط ہے جس نوعیت سے اولی الامر کی اطاعت مشروط ہے۔

جہاں تک ہم غور کر سکتے ہیں معاملہ یوں ہے کہ آنحضرتؐ کی چار واضح حیثیتیں ہیں جن کے احکام میں فرق ہے۔

۱۔ آنحضرت ﷺ کی ایک حیثیت ہے ''رسول'' کی۔ اِس حیثیت سے حضورؐ جو کچھ فرمائیں وہ وحی الٰہی ہوگی اور اس کی اطاعت نہ فقط ہر مسلمان بلکہ خود آنحضرت ﷺ پر بھی واجب ہے اور اس اطاعت سے انکار کر کے کوئی بھی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا یہ اطاعت براہ راست

اطاعت الٰہی ہے۔

۲۔دوسری حیثیت ہے امیر (اولی الامر) کی۔اس حیثیت سے بھی حضورؐ کے ہر فرمان کی اطاعت واجب ہے اور حکم خداوندی ۔۔۔۔ **واولی الامر منکم** کے تحت ہی یہ چیز آتی ہے۔لیکن ایک فرق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امارت اور دوسرے اولی الامر کی امارت میں ضرور رہے گا اور وہ یہ ہے کہ دوسرے تمام اولی الامر میں یہ امکان موجود ہے کہ کسی وقت عمداً یا خطأً اس کی بات فرمانِ الٰہی کے خلاف ہو،لیکن آنحضرتؐ کے متعلق ایسا گمان کرنا بھی کفر تک لے جانے کے لئے کافی ہے۔یہ ممکن ہی نہیں کہ فرمان الٰہی موجود ہو اور حضورؐ اس کے خلاف کچھ فرمائیں آنحضرتؐ کا مقصد بعثت ہی تھا احکام خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا۔تمام اولی الامر کی اطاعت میں کسی وقت معصیۃ الخالق کا امکان ہوسکتا ہے۔لیکن آنحضرتؐ کی امارتی اطاعت میں معصیت الخالق کا گمان بھی کفر ہے۔

۳۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری حیثیت ہے قاضی (جج) کی۔اِس حیثیت سے بھی حضورؐ کے ہر فیصلے کی اطاعت بے چون و چرا واجب ہے اور اِس سے انکار کفر کے سواء کچھ نہیں۔قرآن نے اسے واضح لفظوں میں بیان فرمادیا ہے کہ:۔

فلا وربك لا يومنون حتى يحكموك فى ما شجر بينهم ثم لا يجدوا فى انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما (قرآن مجید)

تمہارے رب کی قسم یہ لوگ اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک تمہیں (اے رسولؐ) اپنے اختلافی معاملات میں حکم نہ بنائیں۔اور پھر (اسی قدر نہیں بلکہ) تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں۔بلکہ پوری طرح سر تسلیم خم کردیں۔

اسی مضمون کو ایک اور جگہ یوں دُہرایا گیا ہے کہ:۔

وما كان لمومن ولا مومنة۔ اذا قضى الله ورسوله امرًا ان يكون لهم الخيرة من امرهم.....

اللہ اور اس کا رسول جب کوئی فیصلہ کردے تو کسی مسلمان مرد و زن کو اِس معاملے میں کوئی

اختیار باقی نہیں رہتا۔

اور اسی سلسلے کی کڑی اس آیت کو بھی سمجھیے کہ:

النبی اولیٰ بالمومنی من انفسهم o

نبی اہل ایمان پر خود اُن کی اپنی ذات سے بھی زیادہ اختیار رکھتا ہے۔

غرض یہ کہ پیغمبر بحیثیت جج کے جب کوئی فیصلہ دے تو اُس کو نہ ماننا بجز کفر کے اور کچھ نہیں۔

یہاں بھی آنحضرتؐ اور دوسرے قاضیوں میں فرق رہے گا۔ مثلاً

اور کوئی کتنے ہی بڑے کردار کا جج ہوا اُس میں اگر ظاہراً نہیں تو تحت الشعور کچھ نہ کچھ جانبداری کا جذبہ ہوگا۔ ہم مذہبی تعلقات، دوستی، احسانمندی، ہم وطنی، ہم لسانی، قرابت مندی، کوئی طمع یا خوف اور دوسرے بے شمار عوامل ہو سکتے ہیں جو کسی قاضی میں نہایت معصومانہ انداز سے جانبداری کے جذبات پیدا کر دیں۔ لیکن ایک پیغمبر کے متعلق اِس قسم کا گمان بھی کفر ہے۔ قاضی کا فیصلہ ماننا بھی فرض ہے۔ کیونکہ ڈسپلن کا یہ لازمی تقاضا ہے اور قومی عدالتی ڈسپلن کو توڑنا بھی کفر سے کم نہیں۔ لیکن قرائن واضحہ سے کوئی شخص اِس کے متعلق جانبداری کا گمان کرے تو وہ کفر نہ ہو گا۔ بخلاف اِس کے رسول کے فیصلے کو بے چون و چرا مان لینا صرف ڈسپلن ہی کا اقتضا نہیں بلکہ ایک شرط ایمان بھی ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یعنی **فلا وربك** ---الخ (اے رسول! تیرے رب کی قسم یہ لوگ وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک تمہیں اپنے اختلافی معاملات میں حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی وغبار بھی نہ محسوس کریں بلکہ پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں) یہ شرط ایمان کسی دوسرے قاضی کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ایک قاضی کے فیصلے کے متعلق ہم جانبداری کا گمان کر سکتے ہیں اور پھر عدالت بالا میں اِس کی اپیل بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس وہ آخری عدالت (سپریم کورٹ) ہے جس کی کوئی اپیل خدا کے ہاں بھی نہیں۔

ایک بات یہاں ضرور سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان سے فیصلے میں بشری لغزش ہو سکتی ہے اور خود رسول بھی ایک بشر ہی ہوتا ہے۔ فیصلے کی غلطی کا امکان سے وہ بھی باہر نہیں ہو

آنحضرت ﷺ نے خود ہی فرمایا ہے کہ:۔

میں بھی ایک انسان ہوں میرے پاس مقدمے آتے ہیں۔ بعض اوقات ایک فریق دوسرے سے زیادہ چرب زبان ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی سچا ہے۔ لہٰذا میں اُسی کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں۔ اس طرح اگر کسی کے حق میں فیصلہ ہو جائے اور اس سے مسلمان کا حق مارا جائے تو وہ دراصل آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو اُس کے پاس چلا گیا۔ اب اُسے اختیار ہے کہ اُسے اٹھائے یا چھوڑ دے۔ (رواہ السنۃ ام سلمہ)

آنحضرت ﷺ نے بحیثیت قاضی کے اپنی پوزیشن کتنی صفائی سے واضح فرما دی ہے جس پر ایک حرف کا بھی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ قاضی بیان شہادت پر ہی اپنا فیصلہ دے گا۔ بیان و شہادت میں اگر فریب ہے تو فیصلہ اصل حقیقت کے مطابق نہ ہوگا۔ لیکن اس کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ اس کے سوا قیام عدالت کی اور کوئی شکل نہیں۔ لیکن اس فیصلے کو تسلیم کر لینے کے باوجود کسی قاضی کے متعلق شعوری یا غیر شعوری طور پر جانبداری کا صحیح یا غلط گمان ہو سکتا ہے اور اگر وہ سپریم کورٹ نہ ہو تو اپیل بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن رسول کے فیصلے کی نہ فقط یہ کہ کوئی اپیل نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس کے متعلق جانبداری کا گمان کفر کے سوا کچھ نہیں۔

۴۔ آنحضرت ﷺ کی مذکورہ تین حیثیتوں ۔۔۔۔ وحی رسالت، امر امیر اور قضائے قاضی۔۔۔ کو سمجھنے کے بعد چوتھی حیثیت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ یہ ہے آنحضرت ﷺ کی بشری حیثیت۔ اس حیثیت سے آنحضرت ﷺ نہ کوئی فرمان وحی پیش فرماتے ہیں نہ وہ امیر کا امر ہوا ہے نہ قاضی کا فیصلہ۔ بلکہ وہ ذاتی رائے ہوتی ہے۔ مشورہ ہوتا ہے۔ سفارش ہوتی ہے یا گمان ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ اور اس کا نہ ماننا قطعاً کوئی کفر نہیں۔ اور مان لینا کوئی واجب و فرض نہیں

ایسے بشری ارشادات کو قبول نہ کرنے کی کئی صورتیں ہیں:۔

(الف) صاف انکار کر دیا جائے۔

(ب) عذر کیا جائے۔

(ج) عمل نہ کیا جائے یا اس کے خلاف عمل کیا جائے۔

(د) اعتراضاً کوئی بات کہی جائے۔

(ہ) مباحثہ کیا جائے۔

(و) ناگواری کا اظہار کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ!

یہ سب کچھ بات نہ ماننے ہی کی شکلیں ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی شکل بھی ایسی نہیں جو کفر ہو یا منافی ایمان ہو۔ خیر القرون میں اِس کی بہت سی نظیریں پائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ صحابہ جیسے خیر امت کو آنحضرت ﷺ سے عقیدت، عظمت، اطاعت اور ادب وغیرہ کا جو ایمانی تعلق تھا آج ہم اُس کے ہزارویں حصے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ لیکن اِس معاملے میں اُن کا کیا طرز عمل رہا ہے، اُسے ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے۔

ا۔ میدانِ بدر میں آنحضرت ﷺ نے ایک جگہ کیمپ لگانے کا حکم دیا۔ سیدنا حبابؓ بن منذر نے پوچھا: کیا یہ جگہ وحی سے متعین فرمائی گئی ہے؟ ارشاد ہوا نہیں عرض کیا۔ پھر یہ جگہ مناسب نہیں۔ فلاں جگہ مناسب ہے۔ اِس کے بعد آنحضرت ﷺ نے جگہ بدل لی۔ ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کی ہر بات واجب الاطاعت ہوتی یا وحی ہوتی تو نہ حبابؓ بن منذر کوئی سوال و جواب کرتے اور نہ آنحضرت ﷺ اپنی بات کو واپس لیتے۔ جناب حبابؓ بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ رسول کی ہر بات وحی کا درجہ نہیں رکھتی اور نہ ہر بات کو بے چون چرا مان لینا ضروری ہے بلکہ کچھ ارشادات ایسے بھی ہیں جن میں قیل وقال کی گنجائش ہے اور وہ واپس بھی لئے جا سکتے ہیں۔ ایسی بات نہ وحی رسالت ہو سکتی ہے نہ امر امیر اور نہ قضائے قاضی، بلکہ وہ آنحضرت ﷺ کی رائے بشری ہی ہو سکتی ہے۔

۲۔ مدینے پہنچنے کے بعد حضور ﷺ نے لوگوں کو نر و مادہ کھجوروں کا جوڑ املاتے دیکھا تو اپنی ناپسندیدگی کا اظہار یوں فرمایا۔ یہ نہ کرو تو بہتر ہے۔ لوگوں نے جوڑ املانا ترک کر دیا تو پھل کم آئے۔ شکایت کی گئی تو فرمایا۔ یہ دنیاوی کاروبار تم زیادہ بہتر سمجھتے ہو۔ چنانچہ جوڑ املانے کا رواج ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد بھی صرف ایک ذاتی رائے تھی۔ وحی نہ تھی ورنہ واپس نہ لی جاتی۔

۳۔غزوہ حنین واوطاس کے بعد حضور ﷺ نے مولفۃ القلوب کوغنیمت کے حصے زیادہ دیئے انصار نے اعتراض کیا اور گویا طنزاً کہا کہ" تلواریں تو ہماری کام کریں اور غنیمت قریش لے جائیں؟"حضور ﷺ نے انصار کو مصلحت بتا کر مطمئن فرمادیا اور انصار کا یہ فعل کفر نہیں سمجھا گیا۔

۴۔صلح نامہ حدیبیہ سے چودہ سو مہاجرین انصار نے (ایک دوسو کے سوا) اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔اور سیدنا عمرؓ نے تو کچھ اپنی حد سے بڑھ کر باتیں کیں۔لیکن کسی کو رسول کا نافرمان یا کافر نہیں سمجھا گیا بلکہ اُن کے لئے رضوان الٰہی کی سند نازل ہوئی۔

لقد رضى الله عن المومنين اذيبايعونك تحت الشجرة۔۔۔

اللہ ان تمام مومنین سے راضی ہوا جب کہ وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے۔

۵۔صلحنامہ حدیبیہ لکھتے وقت کفار قریش کے مطالبے پر حضورؐ نے سیدنا علیؓ سے لفظ "رسول اللہ" قلمزد کرنے کوفرمایا تو اُنہوں نے انکار کردیا۔اوران کا انکار کفر نہیں قرار دیا گیا۔

۶۔سیدنا عمرؓ کو سفیر بنا کر مکے جانے کا حکم دیا۔مگر آپ نے عذر کیا اور آپؓ ہی کی رائے سے سیدنا عثمانؓ بھیجے گئے۔یہ عذر بھی کفر نہ سمجھا گیا۔

۷۔سیدنا زیدؓ بن حارثہ اور اُن کے صاحبزادے اُسامہ بن زیدؓ کو دو موقعوں پر امیر لشکر بنایا تو بہت سے صحابہؓ نے اِس پر اعتراض کیا اور اِس اعتراض کو ایمان کے منافی نہیں بتایا گیا۔

۸۔جناب مغیثؓ کو سیدہ بریرہؓ سے عشق ہوگیا۔آنخضرتؐ نے بریرہ سے فرمایا کہ مغیث سے نکاح کرلو۔بریرہ نے انکار کردیا۔اور اِس انکار کو منافی اسلام نہیں تصور کیا گیا۔

۹۔آنخضرت ﷺ نے ابو ہریرہؓ یا ابوذر غفاریؓ سے فرمایا کہ" لا الٰہ الا اللہ" کے قائل کے لئے دخول جنت کی بشارت سب کو سنادو۔مگر حضرت عمرؓ نے اِس اشاعت کی مصلحتاً مخالفت کی اور آنخضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کی رائے مان لی۔

ہم نے یہ آخری چھ مثالیں نہایت اختصار سے نقل کی ہیں۔یہ سب احادیث وسیر کی روایات ہیں، جن کے غلط ہونے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں (ہم اِن میں سے بعض کے متعلق آگے چل کر کچھ مزید گفتگو کریں گے) یہ ساری مثالیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ بہت سے مواقع پر صحابہؓ نے آنخضرت ﷺ کے قول وعمل کے بے چون چرا نہیں تسلیم کیا بلکہ انکار کیا، اعتراض کیا،

ناگواری کا اظہار کیا سب کچھ کیا لیکن آنحضرت ﷺ نے ان میں سے کسی ایک فرد کو بھی خارج از
اسلام نہ قرار دیا۔ کسی کو منکر حدیث و سنت اور منکر وحی و رسالت نہیں قرار دیا۔ بات بالکل صاف
ہے کہ صحابہؓ آنحضرت ﷺ کی ہر بات کو واجب التسلیم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ صرف وحی کو بے
چون و چرا مانتے تھے یا امر کو یا قضا (فیصلے) کو۔ آنحضرت ﷺ کے ذاتی مشوروں کو نہ وہ واجب
الاطاعت سمجھتے تھے نہ خود آنحضرت ﷺ۔

اچھا اب ذرا ایسی مثالوں کو بھی ملاحظہ فرمایئے جو قرآن پاک کے اندر موجود ہیں۔

۱۔ اوس بن صامت اپنی بیوی خولہؓ بنت ثعلبہ کو ماں سے تشبیہہ دے کر اظہار کرتے ہیں۔ خولہ
آنحضرت ﷺ سے صورت حال بیان کرتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ رواج عرب کے مطابق فتویٰ
دیتے ہیں کہ طلاق ہوگئی۔ (واضح رہے کہ فتویٰ صرف رائے ہوتا ہے، قضائے قاضی یا امر امیر نہیں
ہوتا) خولہ آنحضرت ﷺ سے جھگڑتی ہیں۔ مثلاً شوہر نے طلاق کا لفظ تو بولا نہیں۔ ماں کہا ہے
اور میں اُس کی ماں ہو ہی نہیں سکتی۔ اِس لئے کہ میں نے اُسے جنا نہیں ہے۔ میں نے اپنی جوانی
اُس کے ساتھ ختم کر دی میرے بچے ہیں جن کی کفالت و تربیت نہ ہونے سے سارا گھر برباد
ہو جائے گا۔ حضور ﷺ اپنی رائے پر قائم تھے مگر وحی الٰہی نے اُسے طلاق نہیں بلکہ اظہار قرار دیا۔

ارشاد ہوا۔

قد سمع اللّٰہ قول التی تجادلك فی زوجها و تشتکی الی
اللّٰہ واللّٰہ یسمع تحاورکما۔۔۔

اللہ نے اُس عورت (خولہ) کی بات سن لی جو (اے رسولؐ) تم سے اپنے شوہر کے معاملے
میں جھگڑ رہی ہے اور اللہ سے فریاد کر رہی ہے۔ اللہ تم دونوں (خولہؓ اور رسولؐ) کا مکالمہ سن رہا
ہے......... (اِس کے بعد کفارے وغیرہ بیان کئے گئے)

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ رسولؐ اپنی رائے دیتا ہے یا یوں کہیے فتوے دیتا ہے مگر خولہؓ نہیں
مانتی۔ جھگڑا مباحثہ کرتی ہے مگر رسولؐ اِسے منکر و کافر کہتا ہے نہ خدا اسے قابل گرفت قرار دیتا ہے
بلکہ گویا اُسی کی تائید کرتا ہے۔

۲۔ آنحضرت ﷺ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ بنت جحش کو اپنے متبنیٰ و مولیٰ سیدنا

زیدؓ بن حارثہ کیلئے پیام نکاح دیتے ہیں۔ وہ انکار کرتی ہیں۔ پھر یہ آیت نازل ہوتی ہے۔

فما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی الله و رسوله امرًا ان یکون لهم الخیرة من امرهم:......

اللہ اور اِس کا رسول اگر کسی معاملے کا فیصلہ کردے تو اس معاملے میں کسی مومن و مومنہ کو کوئی اختیار ہی نہیں باقی رہتا۔

پہلے جس زینبؓ نے انکار کیا تھا، اُس نے اب قبول کرلیا۔ کیوں؟ پہلا ارشادِ رسول صرف ذاتی مشورہ تھا اور دوسرا فیصلہ وقضا تھا۔ لیکن آگے سنیئے زینبؓ و زیدؓ میں نباہ نہ ہوسکا۔ زیدؓ نے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو آنحضرتؐ نے جو کچھ فرمایا اُسے زبانِ قرآن سے سنیئے۔

اذ تقول للذی انعم الله علیه وانعمت علیه امسلا علیك زوجك واتق الله۔

(اے رسولؐ) یاد کرو جب تم (زیدؓ سے) جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا یہ کہہ رہے تھے (اے زیدؓ) اپنی بیوی (زینبؓ) کو روکے رکھ (طلاق نہ دے) اور تقویٰ خدا اختیار کر۔

یہ قرآن کے الفاظ ہیں اور اتنے واضح ہیں کہ کوئی تاویل نہیں قبول کرتے۔ رسولؐ نے کہا۔۔ بصیغہ امر کہا۔۔ کہ اپنی بیوی کو روکے رکھ اور طلاق نہ دے۔ فرمائے زیدؓ نے اِس حکم کو مانا نہیں زینبؓ کو طلاق دیدی۔ اِس حکم عدولی کے باوجود نہ کیا۔ زیدؓ معتوب ہوئے؟ منکرِ حدیث وسنت منکرِ وحی و رسالت ہوئے؟ اور نعوذ باللہ خارج از اسلام قرار پائے؟ جی نہیں وہ ہمیشہ کے لئے انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ ہی رہے۔ انہیں جیش اسلامی کی قیادت و امارت بھی نصیب ہوئی اپنے رسولؐ کے پیارے (حب) رہے۔

بات کیا تھی؟ اِس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ بیوی کو طلاق نہ دینے کا حکم نہ وحی رسالت تھا، نہ امر امیر اور نہ قضائے قاضی۔ یہ ایک ذاتی مشورہ تھا۔ بلاشبہ رسول اللہ کے مشورے کو بے چون و چرا مان لینا بھی تسلیم و رضا اور سعادتمندی کا بڑا اونچا درجہ ہے۔ اس سے انکار نہیں لیکن اِسے فرض نہ کرنا چاہیے کہ رسول کے مشورے کو قبول نہ کیا جائے تو یہ نہ کوئی کفر ہے نہ عدولی حکم۔

مشورے کے تو معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ مشورہ دینے والا ماننے اور نہ ماننے کا اختیار دے رہا ہے۔ رسول کسی کو یہ اختیار خود دے تو دوسرا کون ہے جو اس اختیار کو سلب کر کے اپنی عاقبت خراب کرے؟

صحابہ رضی اللہ عنہ کو یہ ملکہ حاصل تھا اس لئے وہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی نوعیت کو سمجھ لیتے تھے اور اچھی طرح تمیز کر لیتے تھے کہ یہ وحی رسالت ہے یا امر امیر قضائے قاضی ہے یا بشری رائے اور اگر کہیں شبہ ہوتا تو دریافت کر لیتے تھے۔ سیدنا حبابؓ بن منذر نے آخر دریافت کر لیا کہ فوجی کیمپ کے لئے یہ جگہ کیا وحی سے مقرر کی گئی ہے؟ حضورؐ نے جواب نفی میں دیا اور بات صاف ہوگئی کہ یہ آنحضرت ﷺ کی ذاتی رائے تھی۔ اسی طرح جناب جریرؓ نے پوچھ لیا کہ "اتامرونی" کیا حضورؐ مجھے مغیث سے نکاح کر لینے کا امر فرماتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا **لا ولکن اشفع** ۔امر حکم نہیں بلکہ سفارش ہے۔ یہاں بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ بشری رائے تھی۔ یوں ہی حدیبیہ میں اگر ان چودہ سو مہاجرین و انصار کو یہ علم ہوتا کہ یہ شرائط صلح بذریعہ وحی لکھوائی جا رہی ہیں تو کوئی چوں بھی نہ کرتا اور اگر کوئی ذرا بھی بولتا تو پہلے اُسے اپنے ایمان کی خیر منانی پڑتی۔ سب کے سب یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ ایک ایسی ذاتی رائے ہے جس میں دوسروں کو اظہار رائے کا حق دیا گیا ہے۔

غرض صحبت نبوی میں رہنے والوں کا یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی کیا نوعیت ہے۔ یہ دشواری تو بعد والوں کو پیش آئی۔ وحی، امر، قضا اور رائے میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے تمام احادیث نبوی کو تقریباً ایک ہی سطح پر رکھ دیا گیا اور ہر ایک کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ حالانکہ تابیر نخلہ والی حدیث کا جو آخری ٹکڑا حضور ﷺ کی زبان سے نکلا تھا اس سے معاملہ بالکل صاف ہو چکا تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا۔

انما انا بشر اذا امرتکم بشی من امر دینکم وخذوا به واذا امرتکم بشی من رائی فانما انا بشر (رواہ مسلم)

دین اصالۃً صرف وحی الٰہی ہے۔ امر امیر۔۔ **واولی الامر منکم** اور قضائے قاضی **حتی یحکموک فیما شجر بینهما** کی اطاعت عین دین ہے کیونکہ یہ بھی ...

خداوندی ہی کا حکم ہے۔ ان کے علاوہ آنحضرتؐ کے تمام ارشادات بشری ارشادات ہیں۔ بلا
شبہ آنحضرت ﷺ کی بشری رائیں بھی تمام اہل عالم کی رایوں پر فوقیت رکھتی ہیں اور ان کو مان لینا
سعادت دارین ہے اس میں کلام نہیں لیکن سوال صرف یہ ہے کہ کیا بشریٰ ارشادات کی وہی
حیثیت ہے جو وحی، امر و قضا کی ہے؟ اور کیا ان کا نہ ماننا انسان کو یکساں طور پر خارج اسلام بنا دیتا
ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے نہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ ذخیرہ احادیث میں وحی
کا اعادہ (آنحضرت ﷺ کے اپنے الفاظ میں) بھی ہے اور امر امیر بھی۔ قضائے قاضی بھی ہے
اور بشری مشورے بھی۔ لہٰذا پہلے تو بشری اور غیر بشری ارشادات کو الگ کرنا ہوگا۔ پھر واجب
الطاعت ارشادات یعنی وحی اور قضاء میں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ کونسا ارشاد شخصی ہے اور کون سا
عمومی؟ کونسا مشروط ہے اور کونسا غیر مشروط؟ اور جو مشروط ہے وہ کن شرائط کے ساتھ مشروط ہے؟

اس وقت ان دو باتوں کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں۔ بس چند نکتے پیش نظر رکھنا کافی ہے۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے جتنی احادیث ہیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جن کا صحیح پس منظر
ہمارے سامنے نہیں آ سکا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بشریٰ اور دینی امور میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا
ہے۔ اور عام طور پر تمام ارشادات رسول کو ایک ہی سطح اور ایک مرتبے پر رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔
ہمارے لئے آج جو دشواری ہے وہ یہ ہے کہ پورا صحیح پس منظر سامنے نہ ہونے کی وجہ سے شخصی و
عمومی، عارضی و دوامی، مشروط و غیر مشروط میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ نبی ہر وقت نبی رہتا ہے لہٰذا نبی کی کسی بات کو نبوت سے الگ
کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ پھر وہ مثال دیتے ہیں کہ سپریم کورٹ کا جج چوبیسوں گھنٹے جج رہتا ہے
وہ جہاں چاہے اجلاس قائم کر سکتا ہے۔ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ رسول بھی ہر وقت رسول رہتا ہے
لیکن اس کی ہر بات رسول کی حیثیت سے نہیں ہوتی۔ جج کی جو گفتگو گھر میں، بازار میں یا کلب
میں ہوتی ہے اس کی وہ حیثیت قطعاً نہیں ہوتی جو اجلاس عدالت کے فیصلہ کی ہوتی ہے۔ رسول
ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ رسالت کا منصب اس سے ہر وقت وابستہ رہتا ہے۔ رسالت کا
یہ مطلب بالکل نہیں کہ رسول جب بھی کچھ بولتا ہے تو رسول ہی کی حیثیت سے بولتا ہے اور وحی
کے سوا اور کوئی بات زبان سے کبھی نکلتی ہی نہیں۔ (جاری ہے)

حقیقت انسان

(مرسلہ حافظ محمد یاسین توحیدی)

ہردل عزیز بھائی چوہدری عبدالرشید صاحب

حقیقت انسان پر یہ مقالہ ہمارے بہت ہی ہردل عزیز بھائی چوہدری عبدالرشید صاحب ساہی آف ڈسکہ نے سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر پڑھا اس مقالہ میں ساہی صاحب نے سب سے پہلے قبلہ محمد صدیق ڈار صاحب اور اپنی طرف سے اجتماع میں شرکت کرنے والے بھائیوں کا شکریہ ادا کیا اور بعد ازاں اپنے خیالات کا اظہار بہت ہی پر جوش انداز میں کیا جس کو ہم یہاں بیان کر رہے ہیں۔

برادرانِ اسلام، اسلام علیکم!

آیا ہوں تیرے میکدہ جو دو سخا میں
یارب مئے عرفان سے مرے جام لو بھر دے

آج کی اِس محفل میں میرا عنوان گفتگو ہے "حقیقت انسان" انسان رب کریم کی مصوری کا اعلیٰ ترین شاہکار، ذات کبریا کا نائب حکمران انسان اللہ رب وعزت کی طرف سے زمین کا مہمان خصوصی، انسان اشرف المخلوقات کے عہدہ پر فائز، انسان مسجود الملائکہ قرآن میں ارشاد ربانی "**لقدخلقن الانسان فی احسن تقویم**" ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے، تسخیر کائنات کے لئے مقرر کردہ ہستی انسان، حکم الٰہی سے مزین کیا گیا انسان، ذات بابرکت جس پر ہر وقت رہتی ہے مہربان ہے وہ ہستی انسان اِس کو مٹی کا پتلا تصور نہ کریہ ہے باعث تخلیق کائنات انسان علامہ اقبال کی نظر میں۔

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدہ افلاک ہے تو
تیرے صید زبوں فرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لو لاک ہے تو

انسان کون ہو سکتا ہے وہ جو صدق صدیقؓ سے بات کرے جو عدل فاروقیؓ سے انصاف کرے، جو حیاء عثمانؓ کا امین ہو، جو علم علی المرتضیٰ حیدر کرارؓ کا مظہر ہو لیکن یہ سب اس وقت رونما ہوگا جب حضرت انسان اپنے مقام سے پوری طرح آگاہ ہو جائے گا اپنی حقیقت کو جان لے گا

اپنے رب کو پہچان لے گا جو نہ پہچان سکا وہ بدی اور برائی کے عمیق گڑھا میں پڑا رہے گا۔ کائنات کا
... مفل ہوتے ہوئے بھی گندگی کے ڈھیر پر ہاتھ مارتا رہے گا اور پاگل، دیوانہ اور فاترالعقل کے
ہوتے پکارا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سورت الروم میں ارشاد فرمایا "**اولم یتفکروا فی**
انفسھم کیا انہوں نے اپنے نفسوں یعنی دلوں میں یہ غور نہیں کیا انسان کے لئے ضروری ہے
... وہ اپنی حقیقت کو پہچانے تا کہ اپنے منصب خلافت سے آگاہ ہو۔ تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو
بھی فاش کر دیا۔ میں ہی تو اک راز تھا سینہ کائنات میں۔ ہر شخص کی زندگی روح کی تابع ہے اور
روح ازل میں اللہ کو دیکھ چکی ہے۔ جو بندہ اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے۔ وہ اس دنیا میں اللہ کو
دیکھ سکتا ہے۔ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں عقلمند وہی ہے جو اپنے آپ کو تحقیق
... کرے میں ازل سے کیا لایا تھا اور اب دنیا سے کیا لئے جاتا ہوں اور عاقبت میں مجھے کیا نعمت
ملے گی۔ فرمایا جو شخص پہلے نفسی عارف ہوتا ہے بعد میں عارف باللہ ہو جاتا ہے۔

جو دل دا محرم ہویا ھو۔ سویوں رب پچھانے ھو

جناب محمد پیر شاہ صاحب فرماتے ہیں جس نے اپنے خود کو پہچان لیا وہ حق سے واصل ہو گیا
اور جس کو خود شناسی حاصل نہیں ہوئی وہ چاہے ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا صاحب کرامت ہو تو بھی
مرتبہ پستی میں تباہ میں۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی خود آگاہی اور خودشناسی کے بارے میں
فرماتے ہیں۔ خودشناسی خداشناسی ہے ورنہ ہستی صنم تراشی ہے۔

پس اسی میں ہے شان استغنے آپ ہی اپنا احترام کرو حضرت شاہ حسین المعروف مادھولال
حسین انسان کو اپنے آپ کو پہچاننے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے انسان اگر تو نے
اپنے آپ کو پہچان لیا تو تیرے لئے حق تعالیٰ کی پہچان آسان ہو جائے گی۔

بندے آپ نوں پہچان بندے آپ نوں پہچان۔ جے تینیں اپنا آپ پچھان سائیں ملن
آسان۔ حضرت بلھے شاہ خود کو پہچاننے کیلئے اپنے اندر جھانکنے اور دیکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ایہہ تلکن بازی ویہڑا اے
وڑ اندر ویکھو کیہڑا اے
تھم تھم کے ٹرو اندھیرا اے
کیوں خلقت باہر ڈھوندہندی اے

منہ آئی بات نہ رہندی اے

جس نے بھی اللہ تعالیٰ کے اسرار اور رموز کو جانا اس نے سب سے پہلے اپنے آپ کو ہی پہچا[illegible] فرماتے ہیں۔

جس پایا بھیت قلندر دا
راہ کھوجیا اپنے اندر دا

چار سو میں محبوب حقیقی کا ہی نور و ظہور ہے اور محبوب ہر وقت تیرے ساتھ ہے شاہ رگ سے بھی قریب ہے، بشرطیکہ تم اپنی ذات کے اندر نور کرو تو خدا کی نشانیاں اپنے ہی اندر نظر آئیں گی۔

جدھا شور چوفیرے پیندا اے
اوہ کول تیرے نت رہندا اے
کتے نحن اقرب کہندا اے
کتے آکھدا اے فی انفسکم

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں۔ اگر انسان اپنے آپ سے مکمل آگاہی حاصل کرے تو ذات حق کو بے پردہ دیکھ سکتا ہے۔ دیدار حق کے لئے اول یہی ہے کہ تو خود اپنی نظر سے پوشیدہ نہ ہو۔

تو ہے میرے کمالات ہنر سے
نہ ہو تو میں اپنے نقش گر سے
میرے دیدار کی ہے اِک یہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

علامہ اقبال کے نزدیک خود آگاہی سے دیدالٰہی حاصل ہوتی ہے اور دیدالٰہی سے شہنشاہی فرماتے ہیں۔

تو اللہ کی امانت کا امین ہے۔ اس لئے غافل نہ ہو بلکہ اپنے آپ کو دیکھ اور پہچان۔ واقف ہو اگر لذت بیداری شب سے، اونچی ثریا سے بھی یہ خاک پراسرار۔

جہاں حضورؐ آرام فرما رہے ہیں

(فیروز الدین احمد فریدی)

رسول کریم ﷺ آج جہاں آرام کر رہے ہیں وہاں سوا چودہ صدی پہلے آپ کی تیسری اہلیہ حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی تھی۔ اِس کی لمبائی تقریباً 16 فٹ اور چوڑائی 12 فٹ تھی جو ہمارے کمروں کا سائز ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہمارے مکانوں میں اس طرح کے کمرے ایک سے زیادہ ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ بیٹھنے، باتیں کرنے اور مہمانوں کو بٹھانے کیلئے الگ جگہیں ہوتی ہیں، مدینے کی اس جھونپڑی میں کوئی غسل خانہ تھا نہ باورچی خانہ، کھانے کیلئے کوئی الگ جگہ تھی نہ مہمانوں کے لئے۔ جو کچھ تھا بس یہ دو سو مربع فٹ کا رقبہ تھا، ہمارے کمروں کی اُونچائی اتنی رکھی جاتی ہے کہ کوئی فرش پر کھڑا ہو اور ہاتھ بلند کرے تو اِس کا ہاتھ چھت پر لگے ہوئے پنکھے کے پروں سے نہ ٹکرائے۔ اِس قدیم اور مقدس جھونپڑی کے بارے میں حضرت حسن بصریؒ لکھتے ہیں کہ میں اپنے لڑکپن میں یہ جھونپڑیاں دیکھنے جایا کرتا تھا جب کھڑا ہوتا تو میرا ہاتھ اِن کی چھت سے لگتا تھا۔ واضح رہے کہ حضرت حسن بصری رسول کریم ﷺ کی اہلیہ محترمہ حضرت ام سلمہؓ کی کنیز کے بیٹے تھے۔ یہ تھی رسول کریم کی ازواج مطہرات کی رہائش گاہوں کی لمبائی، چوڑائی اور اُونچائی۔ ان کی دیواریں کچی اینٹوں کی اور چھتیں کھجور کے درختوں کے پتوں کی ہوتی تھیں۔ اللہ جانتا ہے کہ تیز بارش اور سخت گرمی میں یہ چھتیں اپنے مکینوں کی حفاظت کیسے کرتی ہوں گی؟

رسول کریم ﷺ کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیٹی فاطمہؓ کی جھونپڑی، آپ کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیوی عائشہؓ کی جھونپڑی کے متصل شمال کی سمت تھی۔ واضح رہے کہ مدینہ منورہ میں قبلہ کا رُخ جنوب کی طرف ہے۔ ان دونوں جھونپڑیوں کے دروازے مسجد نبویؐ میں کھلتے تھے اور اب یہ دونوں جگہیں گنبد خضریٰ کے سائے میں ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی کے مشرقی جانب ان کے بالکل پیچھے اور متصل رسول کریم ﷺ کی دوسری اہلیہ حضرت سودہؓ کی جھونپڑی تھی۔ محل وقوع سمجھنے کیلئے یاد رہے کہ مسجد نبویؐ کے مشرق کی طرف جنت البقیع تھا اور ہے۔ حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی کے جنوب اور حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی سے متصل تو نہیں لیکن اس کے سامنے حضرت

حفصہؓ کی جھونپڑی تھی۔ پچھلے چودہ سو برسوں سے جب اربوں کلمہ گو رسول کریم ﷺ کی لحد کے سامنے کھڑے ہو کر پرنم آنکھوں سے آپؐ پر درود وسلام بھیجتے رہے ہیں تو ان میں سے بیشتر کو یہ علم نہیں ہوگا کہ وہ زمین کے اس ٹکڑے پر کھڑے ہیں جو چالیس برس سے زیادہ حضرت حفصہؓ کی رہائش گاہ رہی۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی جھونپڑیوں کے درمیان ایک انتہائی تنگ گلی تھی جس میں ایک وقت میں ایک آدمی بمشکل گزر سکتا تھا حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ اپنی اپنی جھونپڑیاں میں بیٹھی ہوئی ایک دوسرے سے باتیں کرلیا کرتی تھیں۔ حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے علاوہ صرف ایک اور جھونپڑی کا صحیح محل وقوع معلوم ہے۔ اس چوتھی جھونپڑی میں آپؐ کی چوتھی اہلیہ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ صرف دو ماہ رہیں۔ رسول کریم ﷺ سے شادی کے دو ماہ بعد جب ان کا انتقال ہو گیا تو آپؐ نے حضرت ام سلمہؓ سے شادی کی جو اگلے چھپن برس یہاں رہائش پذیر رہیں۔ ازواج مطہرات میں حضرت ام سلمہؓ نے سب سے زیادہ عمر پائی اور سب سے آخر میں وفات پائی۔ ان کا وصال رسول کریم ﷺ کی وفات کے تقریباً نصف صدی بعد ہوا اور کربلا کا سانحہ ان کی زندگی میں پیش آیا گو بعض مورخین اس سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کربلا کے سانحے سے پہلے ہی وفات پا گئی تھیں۔

حضرت ام سلمہؓ کی جھونپڑی کے بعد ایک قطار میں شمال کی جانب پانچ مزید جھونپڑیاں وقتاً فوقتاً بنتی گئیں جو رسول کریم کی پانچ دیگر ازواج مطہرات کی رہائش گاہیں تھیں۔ ہر جھونپڑی سے ملحق تقریباً اسی سائز کا ایک چھوٹا سا عقبی صحن ہوتا تھا جس کے گرد کھجور کے درختوں کی شاخوں سے باؤنڈری بنادی جاتی تھی۔ صحن کے اوپر جانوروں کے بالوں سے بنے ہوئے موٹے جھوٹے کمبل ڈال دیے جاتے تھے تاکہ بے پردگی نہ ہو۔

بالائی سطور سے یہ نقشہ سامنے آتا ہے کہ مسجد نبویؐ کے احاطے کے مشرقی حصے میں قبلے یعنی جنوب کی سمت سب سے پہلی جھونپڑی حضرت حفصہؓ کی رہائش گاہ تھی اس کے نیچے شمال کی جانب پہلی قطار میں ایک دوسرے سے متصل دو جھونپڑیاں تھیں ان میں سے ایک حضرت عائشہؓ کی تھی جو

حضرت حفصہؓ کی جھونپڑی کے بالمقابل تھی اور دوسری حضرت سودہؓ کی تھی جو حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی سے پیچھے مشرق کی جانب یعنی جنت البقیع کی جانب تھی اس کے بعد دوسری گلی میں دو جھونپڑیاں تھیں جن میں سے ایک حضرت عائشہؓ کی اور حضرت علیؓ کی تھی جو حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی سے متصل اور اس کے شمال مغرب میں تھی اور اس کا دروازہ بھی مسجد نبویؐ میں کھلتا تھا اور دوسری حضرت ام سلمہؓ کی تھی جو حضرت سودہؓ کی جھونپڑی کے نیچے اور اس کے شمال مشرق میں تھی یعنی جنت البقیع کی جانب۔

زمین کا وہ خوش نصیب ٹکڑا جسے آج مسجد خضرا نے ڈھانپا ہوا ہے سوا چودہ سو برس پہلے حضرت عائشہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت ام سلمہؓ، اور کسی حد تک حضرت حفصہؓ کی جھونپڑیوں کی جگہ تھی۔ مسجد نبویؐ کے مشرق میں حضرت ام سلمہؓ کی جھونپڑی سے نیچے شمال کے رُخ پانچ اور جھونپڑیاں تھیں۔ یہ تھیں دو دو سو مربع فٹ کی وہ نو جھونپڑیاں جن میں اللہ کے آخری رسولؐ نے اپنی زندگی کے آخری دس برس گزارے یہ تھیں وہ اقامت گاہیں جن میں آپؐ سوئے، لیٹے، بیٹھے، محو گفتگو ہوئے عبادت میں مشغول ہوئے جن میں سے بعد میں آپؐ پر وحی اتری اور انہی میں سے ایک میں آپؐ نے وفات پائی اور آج وہیں آرام فرما رہے ہیں۔

اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ جب کوئی زائر مسجد نبویؐ میں ریاض الجنتہ کے پاس گنبد خضرا کے نیچے سبز جالیوں میں نصب پہلے گول دائرے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے اور رسول کریم ﷺ کے درمیان ظاہری طور پر چند گزوں کا فاصلہ ہوتا ہے سبز جالیوں کے اندر سب سے پہلے حضرت حفصہؓ کی جھونپڑی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اس کے بعد ڈھائی تین فٹ چوڑی وہ گلی والی جگہ ہے جو حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی جھونپڑیوں کے درمیان سے گزرا کرتی تھی اور اس کے بعد حضرت عائشہؓ کی وہ جھونپڑی ہے ہے جس میں جنوب مغرب یعنی قبلے اور جھونپڑی کی اطراف سے پہلی لحد رسول کریم ﷺ کی ہے اور اس سے ذرا نیچے شمال کی جانب آپؐ کے سر اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اس سے ذرا نیچے آپؐ کے دوسرے سر اور خلیفہ حضرت عمرؓ کی قبریں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عائشہؓ کے والد اور حضرت عمرؓ حضرت

یہ تینوں قبریں ایک تقریباً مربع شکل کی مہر بند چار دیواری میں ہیں جو حضرت حفصہ کے والد تھے۔ یہ تینوں قبریں ایک تقریباً مربع شکل کی مہر بند چار دیواری میں ہیں جو حضرت عائشہ کی جھونپڑی ہوتی تھی اور اِس چار دیواری کے گرد ایک ''پانچ دیواری'' کا جنوبی یعنی قبلے کی رُخ والا حصہ ہے۔

رسول کریم ﷺ کی وفات کے تقریباً اسی برس بعد اموی خاندان کے خلیفہ ولید بن عبدالمالک کے دور میں مدینے کے گورنر حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ نے مسجد نبویؐ کی توسیع کا حکم دیا مسجد نبویؐ کا رقبہ جس میں پہلی توسیع رسول کریم ﷺ، دوسری توسیع خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروقؓ اور تیسری توسیع خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ نے کرائی تھی، اب اسلامی مملکت کی محیرالعقل توسیع اور مسلمانوں کی آبادی میں نمایاں اضافے کی وجہ سے ایک بار پھر چھوٹا پڑ گیا تھا۔ بات 91ھ (مطابق 710ء) کی ہو رہی ہے اِس وقت تک رسول کریم ﷺ کی تمام ازواج مطہرات دنیا سے رُخصت ہو گئی تھیں چنانچہ خلیفہ کی ہدایت پر حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی چھوڑ کر باقی تمام جھونپڑیوں کو گرا کر ان کی زمین مسجد نبوی کی توسیع کے لئے استعمال کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ جس روز یہ پرانی جھونپڑیاں گرائی گئیں اس دن مدینے میں ہر آنکھ آشک بار تھی لوگ کہہ رہے تھے اور دیر تک کہتے رہے کہ یہ جھونپڑیاں جوں کی توں برقرار رکھنی چاہئے تھیں تا کہ بعد میں آنے والی نسلوں کو معلوم ہوتا کہ اُن کے آقا و مولانا نے اپنی کبیر سنی کے آخری دس برس کس درویشانہ حالت میں گزارے حالانکہ فتح خیبر کے بعد اگر وہ چاہتے تو اپنے اپنی بیٹی اور ازواج کیلئے پختہ وسیع اور آرام دہ مکانات بنوا سکتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ بعد میں اس کی تعمیر نو کی اور اس کے گرد ایک اضافی بیرونی دیوار بھی بنوئی لیکن اِس تعمیر نو اور توسیع مزید عمل کے دوران جب یہ جھونپڑیاں گرائی گئیں تو ایک رات حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی کی مشرقی دیوار بھی گر گئی اس بارے میں ایک معاصر عبداللہ بن محمد بن عقیل بتاتے ہیں۔

''اس رات مدینہ منورہ میں بارش ہو رہی تھی۔ میرا معمول تھا کہ رات کے آخری حصے میں مسجد نبویؐ میں حاضری دیتا، پہلے رسول کریم ﷺ پر درود وسلام بھیجتا اور پھر نماز فجر تک

میں رہتا۔ میں حسب معمول رات کو نکلا ابھی میں مغیرہ بن شعبہ کے مکان کے پاس پہنچا ہی
کہ اچانک ایک ایسی خوشبو آئی جو میں نے کبھی نہیں محسوس کی تھی۔ مسجد نبویؐ پہنچا تو دیکھ کر حیران
گیا کہ حضرت عائشہؓ کی کوٹھڑی کی ایک دیوار گری ہوئی ہے میں اندر چلا گیا اور رسول اللہ ﷺ کی
خدمت میں سلام پیش کیا میں ابھی وہیں تھا کہ مدینے کے گورنر عمر بن عبدالعزیز بھی آ گئے۔ ان
کے حکم پر کوٹھڑی کو ایک بڑے کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا علی الصبح مستری بلایا گیا اور اسے کوٹھڑی
کے اندر جانے کو کہا گیا، مستری نے کہا کہ اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی ساتھ اندر چلے، گورنر عمر
بن عبدالعزیز چلنے کے لئے کھڑے ہو گئے (حضرت ابوبکرؓ کے پوتے) قاسم بن محمد بن ابوبکر اور
(حضرت عمرؓ کے پوتے) سالم بن عبداللہ بن عمرؓ بھی تیار ہو گئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے
دیکھا تو کہا کہ ہمیں اس مقدس مقام کے مکینوں کے سکون میں خلل ڈالنے سے اجتناب کرنا
چاہئے۔ انہوں نے صرف اپنے آزاد کردہ غلام مزاحم کو اندر جانے کی ہدایت کی جس نے بعد میں
بتایا کہ پہلی قبر دوسری دو قبروں کے مقابلے میں تھوڑی سی نیچی تھی"۔

اس واقعے سے کم از کم 35 برس پہلے حضرت ابوبکرؓ کے یہی پوتے اپنی پھوپھی حضرت عائشہؓ
کی زندگی میں ان کی اجازت سے یہ تینوں قبریں دیکھ چکے تھے جب انہوں نے قبریں دیکھیں تو یہ
سطح زمین سے بہت بلند تھیں نہ سطح زمین کے ساتھ لگی تھیں تینوں قبروں پر سرخ رنگ کی مٹی تھی۔
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کے ایک اور ہم عصر کا بیان ہے کہ اس نے حضرت عمر بن
عبدالعزیزؒ کے زمانے میں یہ تینوں قبریں دیکھیں جو سطح زمین سے تقریباً چار انچ اوپر تھیں۔ حضرت
عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت عائشہؓ کی جھونپڑی کے گرد جو چار دیواری بنائی اس میں ایسے ہی سیاہ
پتھر استعمال کئے گئے جیسے کعبے کی دیواروں میں نصب ہیں اس بات کی تصدیق سینکڑوں برس بعد
ان لوگوں نے کی جنہوں نے صدیوں بعد ہونے والی مرمت کے دوران اس مہر بند کمرے کو دیکھا
اس چار دیواری کے گرد حضرت عمر بن عبدالعزؒ نے جو پانچ پہلوؤں والی بیرونی دیوار کھنچوائی تھی
اس میں پانچ پہلو رکھنے کی مصلحت یہ تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ کی آخری آرام گاہ کا طرز تعمیر کعبہ سے
مختلف رہے جو مستطیل نما یعنی چار پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

پانچ پہلوؤں والی اِس بیرونی دیوار کا نقشہ کچھ اس طرح ہے کہ جب آپ اس مقام پر کھڑے ہوں جہاں گول دائرے بنے ہیں اور جس کے سامنے رسول اللہ ﷺ اور ان کے دو خلفاء آرام کر رہے ہیں تو سبز جالیوں کے بیچ میں سے جو آپ کو نظر آتا ہے وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بنوائی ہوئی اس بیرونی دیوار کا جنوبی حصہ ہے جو خط مستقیم کی طرح ہے۔ اگر آپ کو سبز جالی میں سے اندر جھانکنے کا دفعتاً موقع ملے تو آپ کو عربی تحریروں سے مزین سبز کپڑا نظر آئے گا یہ سبز غلاف ہے جو عمر بن عبدالعزیزؒ کی بنوئی ہوئی اِس بیرونی دیوار کے جنوبی حصے پر چڑھا ہوا ہے۔

اگر آپ یہاں سے آگے چل کر بائیں طرف مڑیں تو آپ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بنوائی ہوئی اس بیرونی دیوار کے مشرقی حصے کی طرف آ جائیں گے۔ جو جنت البقیع کی جانب ہے۔ مشرق کی سمت یہ بیرونی دیوار جو ظاہر ہے کہ سبز جالی کے اندر ہے خط مستقیم میں نہیں ہے اس طرف دیوار دو حصوں میں ہے جنوب (یعنی قبلے کی جانب) سے شمال کو جاتے ہوئے بیرنی دیوار کا ایک حصہ خط مستقیم میں ہے لیکن آگے جا کر یہ بیرونی دیوار وتر کا زاویہ بناتی ہوئی شمال مغرب کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اگر آپ مواجہ شریف کے آگے جا کر بائیں طرف مڑنے کے بجائے مواجہ شریف کے مغربی سمت مڑیں تو آپ ریاض الجنۃ میں داخل ہو جاتے ہیں اس کے بالمقابل سبز جالیوں کے اندر بیرونی دیوار کا مغربی پہلو ہے یہ پہلو بھی خط مستقیم میں نہیں ہے۔ اس طرف بھی دیوار دو حصوں میں ہے جنوب سے شمال کو جاتے ہوئے آپ کو سبز جالیوں میں تین ستون دکھائی دیں گے جو آدھے سبز جالیوں کے اندر اور آدھے سبز جالیوں کے باہر ہیں اِن تین ستونوں کے نام "السریر، الحرس اور الوفود" ہیں۔ السریر سے الوفود کو جاتے ہوئے دیوار کا ایک حصہ خط مستقیم میں ہے لیکن آگے جا کر دیوار پھر وتر کا زاویہ بناتی ہوئی شمال مشرق کی طرف مڑ جاتی ہے اور پھر اپنے بالمقابل مشرق کی سمت سے وتر کے زاویے پر آنے والی دیوار سے شمال میں مل جاتی ہے دوسرے الفاظ میں قبلے یعنی جنوب کی جانب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بنائی ہوئی بیرونی دیوار خط مستقیم ہے شمال میں کوئی بیرونی دیوار نہیں ہے بلکہ اس سمت مشرق اور مغرب سے آنے والی بیرونی دیواریں وتر کے

زاویے بنائے ہوئے مل جاتی ہیں مشرق اور مغرب کی سمت کی بیرونی دیواریں اور دو دو حصوں
مشتمل ہیں ایک خط مستقیم میں اور دوسرا وتر کا زاویہ لئے ہوئے۔ اس طرح جنوب کی سمت ایک
دیوار ہے، مشرق کی طرف دو دیواریں، مغرب کی طرف دو دیواریں اور اس طرح پانچ دیوار
بن جاتی ہیں۔

گنبد خضریٰ کے نیچے شمال مشرق یعنی ریاض الجنۃ کی جانب حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی
جھونپڑی تھی اور اس کے شمال مغرب میں اِس کے بالمقابل حضرت اُم سلمہؓ کی جھونپڑی تھی۔ رسول
کریم ﷺ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی جھونپڑی کے باہر شمال کی سمت تہجد ادا کرتے تھے جس
کی وجہ سے یہاں سبز جالی کے پیچھے ایک محراب ہے جو ''محراب تہجد'' کہلاتی ہے لیکن باہر سے نظر
نہیں آتی اس محراب کے آگے دیوار کے ساتھ آج پیتل کی ایک دیدہ زیب منقش جالی لگی ہوئی
ہے۔ اور اِس کے ساتھ قرآن کے سینکڑوں نسخے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اس منقش جالی کے عین
سامنے وہ گزرگاہ ہے جو ایک طرف (مشرق کی سمت) باب جبریل اور دوسری طرف (مغرب کی
سمت) باب جبریل اور دوسری طرف (مغرب کی سمت) ریاض الجنۃ کو جاتی ہے اگر آپ باب
جبریل سے مسجد نبویؐ میں داخل ہوں جو ہر زائر کی ترجیح ہوتی ہے تو چند گز بعد آپ کے بائیں
جانب پیتل کی یہ منقش جالی اور دائیں جانب قالینوں سے ڈھانپا ہوا ایک چبوترہ ہوگا جسے بیشتر
زائرین غلطی سے ''اصحابہ صفہ'' کا چبوترہ سمجھ کر اس پر جگہ حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے
ہیں۔ اولاً تو '' صفہ'' کا مطلب سائبان ہوتا ہے چبوترہ نہیں دوسرے وہ مقام جہاں دورِ
رسالت ﷺ میں آپؐ کے ساتھ ستر اصحاب بیک وقت قیام کیا کرتے تھے وہ جگہ اِس چبوترہ سے
چند گز آگے ہے اور اس جگہ پر کوئی شناختی علامت نہیں ہے موجودہ چبوترہ سلاطین ترکی کے دور میں
مسجد نبویؐ کے محافظوں کے بیٹھنے کے لئے بنایا گیا تھا۔

881ھ (مطابق 1676ء) میں حضرت عائشہؓ کی کوٹھڑی کی چار دیواری اور حضرت عمر
بن عبدالعزیزؒ کی تعمیر کو وہ پانچ پہلوؤں والی دیوار دونوں کو مرمت کی ضرورت پڑ گئی۔ علامہ سہودی
نے اس مرمت میں رضا کارانہ طور پر حصہ لیا۔ وہ بتاتے ہیں'' چودہ شعبان 881ھ کو پانچ

گرا چکے تو دیکھا اندرونی دیوار میں بھی دراڑیں
پہلوؤں والی بیرونی دیوار کو مکمل طور پر گرانا پڑا اسے گرانی پڑی اب مقدس حجرہ ہماری
پڑی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اندرونی چار دیواری بھی مکمل طور پر گرانی پڑی اب مقدس حجرہ ہماری
آنکھوں کے سامنے تھا میں شمال کی جانب (قبلے کے مقابل کی سمت) سے اندر داخل ہوا تو خوشبو
کی ایک ایسی لپٹ آئی جو زندگی میں کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ میں نے رسول مکرم ﷺ اور ان کے
دونوں خلفاء کی خدمت میں ادب سے سلام پیش کیا۔ مقدس حجرہ مربع شکل کا تھا اور اس کی چار
دیواری کی تعمیر سیاہ رنگ کے پتھروں سے ہوئی تھی جیسے کعبے کی دیواروں میں استعمال ہوئے
ہیں اس چار دیواری میں کوئی دروازہ نہ تھا میری پوری توجہ تین قبروں پر مرکوز تھی۔ تینوں قبریں سطح
زمین کے تقریباً برابر تھیں صرف ایک قبر سطح زمین سے تھوڑی سی بلند تھی۔ یہ غالباً حضرت عمرؓ کی قبر
تھی قبروں پر عام مٹی پڑی ہوئی تھی۔ میں کام میں مشغول ہو گیا جو تین ہفتے میں سات شوال کو مکمل
ہو گیا۔

اس بات کو سوا پانچ صدیاں بیت چکی ہیں اِن پانچ صدیوں میں اِس کے بعد کوئی شخص اس
مہر بند چار دیواری میں داخل نہیں ہوا آج کل بعض لوگ رسول کریم ﷺ کی قبر کے فوٹو دکھاتے
ہیں جو ان کی کہنے کے مطابق گزشتہ صدی میں کسی شخص نے کسی طرح لے لئے اِس فوٹو میں آپ
کی قبر سطح زمین سے کافی اونچی اور چادروں سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہے سرہانے عمامہ نظر آتا ہے
اس مضمون کے قارئین کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جس چار دیواری میں سوا پانچ سو برس سے
کوئی انسان داخل نہ ہوا ہو وہاں فوٹو کیسے لیا جا سکتا ہے؟ اِن تصاویر کے سوداگر خواہ وہ یہ کام
جہالت سے کر رہے ہیں یا مالی منفعت کیلئے اپنی عاقبت کے لئے اچھا سودا نہیں کر رہے۔
رسول کریم ﷺ کے آرام گاہ کے بارے میں جو کچھ الفاظ میں اوپر بیان کیا گیا ہے اب
ایک نقشے میں نیچے واضح کیا جاتا ہے۔ (بشکریہ نوائے وقت)

اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

فوائد الفوائد ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاؒ

(۲) منہاج سراج نے اپنی مشہور تاریخ موسومہ طبقات ناصری میں صفحہ ۹۸ پر سلطانہ رضیہ بنت التمش کے عہد حکومت کے واقعات میں لکھا ہے۔

"۶۳۴ھ میں نورترک قرمطی نے ملتان سے نقل مکانی کر کے دہلی میں ایک خانقاہ قائم کی۔ اپنے آپ کو صوفی ظاہر کر کے بہت سے مسلمانوں کو اپنا معتقد بنالیا۔ رفتہ رفتہ گجرات اور سندھ کے بہت سے قرمطی اس خانقاہ میں جمع ہو گئے۔ نورترک نے اپنی خانقاہ میں وعظ و تلقین و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ اپنی تقریروں میں سنی علماء کو ناصبی کہتا تھا اور عوام کو ابوحنیفہ کے مذہب سے متنفر کرتا تھا"۔

جب عوام پر اس کا مذہبی اقتدار قائم ہو گیا تو ۶ رجب ۶۳۴ھ کو جمعے کے دن قرامطہ نے جامع مسجد میں داخل ہو کر نہتے مسلمانوں کو قتل عام شروع کر دیا۔ مگر انجام کار شاہی فوج نے ان کو مغلوب کر کے تہ تیغ کر دیا۔

قاضی منہاج کی یہ شہادت ہم عصرانہ ہے۔ اس لئے یقینی طور پر صحیح ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ نورترک ایک قرمطی داعی تھا۔ لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی تصنیف اخبار الاخیار میں جو اس واقعے کے چار سو برس بعد لکھی گئی، یہ لکھا ہے:۔

"اگرچہ قاضی منہاج نے طبقات ناصری میں اس شخص کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ اس سے تشیع مذہب لازم آتی ہے مگر فوائد الفوائد میں یہ مذکور ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ اگرچہ بعض علماء نے اس کی مذمت کی ہے مگر وہ "از آب آسماں پاکیزہ تر بود"۔

فوائد الفوائد کے اس ایک جملے سے نورترک قرمطی زمانہ مابعد کے صوفیوں کی نظر میں آسمان کے پانی سے بھی پاکیزہ تر بن گیا۔ کیونکہ کسی صوفی میں یہ اخلاقی جرات نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ سکے کہ یہ فقرہ الحاق ہے اور کسی قرمطی نے اپنی طرف سے ملفوظات شیخ میں اضافہ کر کے اسے سلطان

المشائخ سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ حقیقت یہی ہے وجہ اِس کی یہ ہے کہ ایک معتبر معاصرانہ
شہادت بہرحال لائق تسلیم ہے۔

ملفوظات بہرحال ملفوظات ہی ہیں انہیں استناد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ قاضی منہاج صاف
لکھتے ہیں کہ وہ قرمطی تھا اور اِس کی خانقاہ میں بہت سے قرمطی سکونت پذیر تھے اس لئے ثابت
ہوا کہ وہ آب آسمان سے پاکیزہ تر نہیں ہے۔ لہٰذا یہ جملہ سلطان المشائخ کا نہیں ہے کسی نے ان
سے منسوب کر دیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ملفوظات کے مجموعے از اول تا آخر لائق اعتماد ہیں۔ ہرگز کو راحۃ
القلوب کے نام سے مرتب کیا تھا۔ میرے پیشِ نظر اِس کا جو نسخہ ہے وہ ۱۳۰۹ھ میں طبع ہوا تھا
اِس کے صفحہ ۸۵ پر یہ ''ملفوظ'' درج ہے جس کا اردو ترجمہ میں بقائمی ہوش و حواس ذیل میں نقل
کرتا ہوں۔

''ایک دن آنحضرت ﷺ با جمیع صحابہ کبار بیٹھے ہوئے تھے حضرت معاویہؓ، یزید پلید کو اپنے
کاندھے پر بٹھائے سامنے گذرے، آنحضرت ﷺ ہنسے اور کہا سبحان اللہ، ایک دوزخی ایک بہشتی
(جنتی) کے کاندھے پر سوار ہو کر جا رہا ہے۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ، نے یہ بات سن کر کہا،
یارسولؐ اللہ یہ تو معاویہ کا بیٹا ہے، دوزخی از کجا است؟ آنحضرتؐ نے فرمایا یا علی یہ یزید بد بخت وہ
جو حسن اور حسین اور میری تمام آل کو شہید کرے گا۔ یہ سن کر علیؓ کھڑے ہو گئے۔ تلوار نیام سے نکالی
کہ ایشاں را بکشد مگر آنحضرت ﷺ مانع ہوئے کہ اے علی ایسا مت کر کہ اللہ کی تقدیر یہی فیصلہ کر
چکی ہے۔ یہ سن کر علیؓ رونے لگے اور پوچھا یا رسول اللہؐ! آپ اس وقت ہمارے سر پر (زندہ)
ہوں گے؟ فرمایا نہیں۔ پھر پوچھا یاروں میں سے کوئی زندہ ہوگا؟ ...... (لفظ پڑھا نہ جا سکا) پھر
پوچھا میں زندہ ہوں گا؟ کہا نہیں، پھر پوچھا فاطمہؓ ہوں گی؟ کہا نہیں۔ پھر پوچھا یا رسول اللہ!
میرے غریبوں کا ماتم کون کرے گا؟ جواب دیا میرے اُمتی۔ اِس کے بعد علیؓ اور رسولِ خدا صلعم
دونوں روئے اور شہزادوں کو سینے سے لگا کر بآواز بلند کہا کہ اے غریبو ہم نہیں جانتے کہ اِس دشت
میں تمہارا کیا حال ہوگا'' (انتہیٰ بلفظہ)

تنقید و تبصرہ سے پہلے ناظرین اس بات پر غور کریں کہ اس روایت کا ناقل کون ہے؟ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء وہ کس سے نقل کر رہے ہیں؟ اپنے پیرو مرشد شیخ المشائخ حضرت فریدالدین گنج شکر سے۔اب وہ کون سا چشتی ہوگا جسے اِن خرافات کی صحت میں شک ہو سکتا ہے؟ لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ روایت از اول تا آخر کذب و افترا اور بہتان ہے کیونکہ:۔

(الف) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بلا شک و شبہ ۱۱ھ میں ہوگئی تھی۔

(ب) امیر یزیدؒ کی ولادت ۲۶ھ میں ہوئی تھی۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ افسانہ سراسر جھوٹا ہے کسی سبائی نے یہ لغو اور من گھڑت داستان ملفوظات میں شامل کر دی ہے تا کہ مسلمان بالعموم اور چشتی افراد بالخصوص اِس شخص کو دوزخی یقین کر لیں جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی تھی کہ ”پہلا لشکر جو قیصر روم پر حملہ آور ہوگا مغفور ہے“۔

ظاہر ہے کہ یہ بشارت آپؐ نے وحی الٰہی کی بنا پر دی تھی۔اس کی صداقت میں کوئی شک نہیں ہے۔اب سنیئے کہ جس لشکر نے سب سے پہلے قیصر کے شہر پر حملہ کیا تھا اس کی قیادت امیر یزید نے کی تھی اور حضرت حسینؓ کے علاوہ بہت سے صحابہؓ نے اسی لئے باشتیاق تمام اس جہاد میں شرکت کی تھی کہ حضور انور صلعم نے مجاہدین کے جنتی ہونے کی بشارت دے دی تھی۔دیگر صحابہؓ کے ساتھ حضرت حسین نے بھی اسی شخص کی اقتدا میں نمازیں پڑھی تھیں جسے مسلمان کہلانے والے دوزخی سمجھتے ہیں۔کیا خدا کی شان ہے! جسے حضورؐ مغفور قرار دیں، آپ کے نام لیوا اسے ملعون کہتے نہیں تھکتے۔

خیر یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی۔میں نے اپنا دعوی ثابت کر دیا کہ جو ملفوظات بزرگانِ دین سے منسوب ہیں وہ کلیتہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ان میں سبائیوں نے جھوٹی روایات اپنی طرف سے داخل کر دی ہیں۔

جامی پر دست درازی

(۳) سنائی، عطار، اور رُومیؒ کے بعد صوفیانہ ادب میں جامی کا نام معروف ترین ہے۔جیسا کہ

ہر طالب علم جانتا ہے۔ جامی سلسلہ عالیہ نقشبندیہ سے وابستہ ہیں۔ یہ سلسلہ افضل الصحابہ، بلکہ
افضل البشر بعد الانبیاء وارث کمالات نبوت، متمکن ذروۂ ولایت، ثانی اسلام و غار و بدر و قبر خلیفہ
رسولؐ بلا فصل، امیر المومنین قدوۃ الصدیقین سیدنا و مولانا حضرت ابوبکر الملقب بصدیق اکبر رضی
اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ جامی نے سب سے پہلے مولانا سعد الدین کاشغری نقشبندیؒ کے ہاتھ پر
بیعت کی اور ان کی وفات ۸۶۰ھ کے بعد خواجہ ناصر الدین الملقب بخواجہ احرار ۸۹۵ھ سے
رشتہ ارادت استوار کیا اور باقاعدہ سلوک طے کر کے وہ مقام حاصل کیا کہ ان کا شمار سلسلہ نقشبندیہ
کے مشائخ میں ہوتا ہے تمام تذکرہ نویسوں نے انہیں اہل سنت میں شمار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی
اکثر تصانیف میں خلفائے اربعہؓ کی مدح کی ہے مثلاً

یکے ثانی اثنین در کنج غار
کہ چوں مارشد ناوک جاں شکار
دوم آنکہ از سکہ عدل اوست
کزیں گونہ دنیا و دین سرخ روست
سوم شرم گیتی کہ شد بے قصور
ز شمع نبوت نصیبش دو نور
چہارم کہ آں ابر در یا نثار
غم او کرم برق او ذوالفقار

(مثنوی خرد نامہ اسکندری)

وز میانِ ہمہ نبود حقیق
بخلافت کسے بہ از صدیقؓ
وز پے او نبود ازاں احرار
کس چو فاروقؓ لائق ایں کار
بعد فاروقؓ جز بذی النورینؓ

کار ملت نیافت زینت و زین
بود بعد از ہمہ بعلم و وفا
اسدؓ اللہ خاتم الخلفاء
لعن کزرا فضی شود واقع
شود آں لعن ہم بدوراجع

(سلسلہ الذہب)

آں چار ستون خانہ دیں
واں چار چراغِ بزم تمکین
ہر یک بخلافت سزاوار
ہر چار یکے و ہر یکے چار
ایشاں بہ یگانگی بہم راست
بیگانگی از فضول ماخاست

(لیلیٰ مجنوں)

لیکن اِن تصریحات کے باوجود بعض لوگوں نے ان کو مائل بہ تشیع قرار دیا ہے اور بعضوں نے ان کو اہل تقیہ میں شمار کیا ہے چنانچہ محمد حسین الحسینی خاتون آبادی لکھتا ہے۔

''اِن تمام دلائل کے باوجود جو ان کے ناصبی ہونے پر شاہد ہیں۔ ہم ان کو اہل تقیہ میں شمار کر سکتے ہیں یعنی وہ دل میں شعیہ تھے مگر زبان اور قلم سے اپنے آپ کو سنی ظاہر کرتے تھے''۔

پھر اپنے مدعا کی تائید میں اِس نے یہ حکایب نقل کی ہے جس کا راوی علی بن عبدالعال ہے وہ کہتا ہے کہ:۔

''میں سفر نجف میں جامی کے ساتھ تھا میں نے تقیہ کر کے اپنے عقائد کو ان سے پوشیدہ رکھا تھا۔ جب ہم بغداد پہنچے تو ایک دن لب دجلہ تفریح کے لئے گئے۔ اتفاقاً ایک قلندر وہاں آ نکلا اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی شان میں ایک قصیدہ غرا سنانا شروع کیا۔ جامی پر رقت طاری ہو گئی اور سر بسجود ہو گئے۔ پھر سر اُٹھایا قلندر کو پاس بلایا اور بہت انعام دیا۔ اس کے بعد مجھ سے پوچھا تم

نے مجھ سے گریہ اور سجدے کا کوئی سبب کیوں نہیں پوچھا؟ میں نے کہا اس کا سبب آشکار تھا کیونکہ علی خلیفہ چہارم ہیں اور ان کی تعظیم واجب ہے"۔

یہ سن کر جامی نے کہا، علی خلیفہ چہارم نہیں ہیں بلکہ پہلے خلیفہ ہیں۔ اب مناسب ہے کہ میں تصفیہ کا لبادہ اتاروں اور چونکہ ہمارے درمیان مودت پیدا ہو چکی ہے اس لئے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں شیعان خلص امامیہ میں سے ہوں لیکن تقیہ کرنا واجب ہے۔

نیز بعضے از افاضل ثقات نے بیان کیا ہے کہ ہم نے جامی کے خدام سے یہ سنا ہے کہ ان کے تمام اہل بیت مذہب امامیہ رکھتے تھے لیکن مولانا تقیہ میں بہت مبالغہ فرماتے تھے اور ہمیشہ اپنے اہل و عشیرت کو اس کی وصیت کرتے رہتے تھے۔

یہ فسانہ عجائب نقل کرنے کے بعد کلیاتِ جامی کا مقدمہ نگار لکھتا ہے کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اُس سے تمام نسبت بشیعہ امامیہ تو ثابت ہوتا ہے لیکن یہ تمام دلائل بہت سست پایہ ہیں کیونکہ جامی نے صاف لفظوں ابوطالب کو کافر قرار دیا ہے۔

بعضوں نے کہا ہے کہ جامی شروع میں سنی تھے مگر آخر عمر میں شعیہ ہو گئے تھے۔ مقدمہ نگار صفحہ ۱۹۸ پر پھر لکھتا ہے کہ "چونکہ جامی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں اور بعض غزلوں میں بھی ان کی توصیف کی ہے اس لئے بعض لوگوں نے انہیں روش امامیہ اور تشیع سے منسوب کر دیا ہے"۔

خلاصہ کلام ایں کہ جامی کے بارے میں حسب ذیل خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔

(۱) بعض انہیں سنی کہتے ہیں اور سنی بھی نقشبندی۔

(۲) بعض نے انہیں مائل بہ تشیع لکھا ہے۔

(۳) بعض کا خیال ہے کہ وہ ساری عمر تقیہ فرماتے رہے۔

(۴) بعض کا فیصلہ یہ ہے کہ شروع میں سنی تھے لیکن قبل وفات شیعہ ہو گئے تھے۔

فتنہ پردازوں نے یہ اتہامات اِس شخص پر لگائے ہیں جس نے سلسلۃ الذہب میں صاف طور پر لکھا ہے:۔

بود بو طالب آں تہی زطلب
مر نبیؐ راعم و علیؓ را اب
خویش و نزدیک بود با ایشاں
نسبت دیں نیافت با خوشیاں
ہیچ سودہ نداشت آں نسبش
شد مقردر سقر چو بو لہبش

انہی اشعار کی پاداش میں بقول مقدمہ نگار" شاہ اسماعیل صفوی ہنگام تسخیر بلدہ ہرات بنابر تعصب مذہب قبر مولوی رامنہدم ساخت" صفحہ ۱۹۳

اس کے باوجود ارباب کیس نے ان کے مذہبی عقائد کو عامتہ المسلین کی نظروں میں اور کچھ نہیں تو مشتبہ اور محل بحث ونزاع یقیناً بنادیا ہے۔

باطل پرستوں نے ایک جھوٹی روایت بھی تصنیف کر دی کہ سفر نجف میں انہوں نے اپنے ہم سفر سے اپنے شیعہ ہونے کا اقرار کیا تھا۔ یہ روایت بالکل لغو اور بے اصل و بے سند ہے مگر یہ طائفہ ضالہ بخوبی واقف ہے کہ عوام نہ تنقید کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ انہیں تنقید کی فرصت ہوتی ہے۔

جامی کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے یہ سب کلیات جامی کے مقدمے سے ماخوذ ہے جو ہاشم رضا ایرانی نے لکھا ہے۔(صفحہ ۸۶تا۹۶و۱۹۱تا۱۹۷)

میرا مقصد اس بحث سے یہ واضح کرنا ہے کہ سبائیہ باطنیہ اور دشمنان صحابہؓ نے مشہور صوفیوں کے عقائد میں دیدہ ودانستہ ایسے شبہات پیدا کر دیئے ہیں جن سے ان عقیدت مندوں کے قلوب میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ وہ یا تو تقیہ کرتے تھے یا مائل تشیع تھے اور اس طرح انہیں ان کے (اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ قدرتی طور پر ان کا میلان بھی تشیع کی طرف ہو جائے گا) آبائی مذہب سے برگشتہ کرنا آسان ہو جائیگا۔ راقم الحروف کے استنتاج کی بحث تاریخی شواہد سے ثبوت کو پہنچ سکتی ہے۔ پاکستان کے اکثر و بیشتر سنی بزرگوں کے مزاروں کے سجادہ نشین اور متولی، مذہب امامیہ اختیار کر

چکے ہیں اور اپنے بزرگوں کے جاہل عقیدت مندوں سے یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرات بھی امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ کیا طرفہ تماشا ہے! صاحب مزار سنی تھا، لیکن آج اس کا سجادہ نشین یا متولی شیعہ ہے۔

رومی کے دیوان اور ملفوظات میں الحاق

(۴) رومیؒ کی مثنوی میں جہاں تک میری ملفوظات میں سبائیہ اور قرامطہ نے تدسیس نہیں کی لیکن ان کے دیوان میں چند غزلیات اپنی طرف سے ضرور داخل کر دی ہیں اور ان کے ملفوظات میں بھی ایک روایت ایسی درج کر دی ہے جو رومیؒ ہرگز بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت میرے پیش نظر فیہ مافیہ کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس میں صفحہ ۹۹ پر یہ روایت رومیؒ سے منسوب ہے پڑھیئے اور سر دھنیے۔

نقل ہے کہ ایک شب آنحضرتؐ اپنے صحابہؓ کے ساتھ کسی غزوہ سے واپس آئے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ بہانگ دہل اعلان کر دو کہ آج کی رات ہم شہر کے دروازے کے پاس بسر کریں گے اور کل صبح شہر میں داخل ہوں گے۔ یہ سن کر صحابہؓ نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا یہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی بیویوں کو اجنبی لوگوں کے ساتھ مباشرت میں مشغول پاؤ اور یہ دیکھ کر تمہیں بہت صدمہ ہوگا اور ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ لیکن ایک صحابی نے حضورؐ کے ارشاد پر عمل نہ کیا وہ اپنے گھر چلے گئے، چنانچہ انہوں نے اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ مشغول پایا۔

اس لغو روایت پر تنقید کرنے کو دل نہیں چاہتا تاہم دل پر جبر کر کے اتنا لکھنا ضروری ہے کہ یہ روایت کسی سبائی کے خبث باطنی کی مظہر ہے۔ اس نے آنحضرت ﷺ کی نبوت کو بھی ختم کر کے اپنی اسلام دشمنی کا پورا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے۔

(الف) اگرچہ آنحضرت ﷺ کو بذریعہ علم غیب معلوم ہو چکا تھا کہ صحابہؓ کی بیویاں غیروں سے زنا کرا رہی ہیں اس کے باوجود آپؐ نے چشم پوشی فرمائی اور اس فعل شنیع کو گوارا کر لیا۔ سبحان اللہ! راوی نے رسول اللہ کی سیرت کا کتنا بلند نقشہ کھینچا ہے۔

(ب) بعض صحابہؓ نافرمان بھی تھے یعنی رسول اللہ مومنوں اور منافقوں میں ساری عمر امتیاز نہ

کر سکے۔

(ج) بعض صحابہؓ کی بیویاں زنا کار تھیں۔

(د) رسولؐ کی سیرت اور تعلیم کا صحابہؓ پر کوئی اثر مرتب نہیں تھا۔

(ہ) رومی اِس قدر غیر محتاط تھے کہ بلا تحقیق لغو اور بے سرو پا روایات اپنی مجلسوں میں بیان کرتے رہتے تھے کیونکہ نہ تو انہوں نے یہ بتایا کہ اِس خرافات کا واضع کون ہے اور نہ یہ بتایا کہ وہ غزوہ کون سا تھا؟ اور نہ یہ بتایا کہ یہ روایت انہوں نے حدیث یا سیرت یا مغازی کی کونسی کتاب میں پڑھی تھی۔

غور کیا اِس خبیث سبائی نے ایک تیر سے کتنے شکار کیئے! طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہ روایت جو بفوات کا بدترین نمونہ ہے صدیوں سے کتابوں میں نقل ہوتی چلی آ رہی ہے کسی مسلمان کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اِسے جعلی قرار دے کر کتاب سے خارج کر دیتا۔

دراصل یہ نتیجہ ہے شخصیت پرستی اور تقلید کورکا جو کتاب بھی یا جو شعر بھی کسی ولی اللہ یا امام سے منسوب ہو جائے، کسی مسلمان میں اِس پر تنقید کی جرات نہیں ہوسکتی۔ تصوف یا فقہ کا یہی وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں ذوق تحقیق ہی ختم ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی علمی ترقی رُک گئی وہ آج بھی اِسی مقام پر ہیں جہاں نویں صدی میں تھے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے

(جاری ہے)

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف

قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقو
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آ
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار و رموز اور نف
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عم

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطب... مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالان
اجتماعات پر ارشاد فرمائے انمیں درج ذیل خصو... سائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی ... کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فر
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طر
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انھیں
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ
اوراد و اذکار اور اعمال و اشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کی
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔